حقوق محفوظ

مذاکرات نیاز

یا

مقالات

نیاز فتحپوری کے بعض ادبی انتقادی مضامین

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نے

باہتمام سید توسل حسین

یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا

باردوم ... ۲جلد ـــــ سنہ ۱۹۴۲ء ـــــ قیمت عہ

یکے از غوازی مصر ـــ اے رفیقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام

.... اکتوبر سنہ ۲۷ ۱۹ء

....

....

شام ۔ دن بھر کی تھکا دینے والی دماغی وجسمانی مصروفیت کا تقاضا صرف یہ تھا کہ میں خاموش کسی کھلی ہوئی جگہ میں آنکھ بند کر کے لیٹ جاتا اور سکون کے ساتھ شام کی خنکی میں طلوع ماہ کا انتظار کرتا۔ جب چاند حالت انحطاط میں ہوتا ہے تو اس کا سوگوارانہ طلوع، جسے اسکر وائلڈ کسی "ملکہ کے جنازہ" سے تشبیہ دیتا ہے، میرے لئے خاص کشش رکھتا ہے لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

آج شہر کے رنگین مزاج اور رنگینی پسند طبقہ میں صبح سے خاص قسم کا ہیجان پیدا ہے، کیونکہ آج عکاس خانہ میں "بلبل پرستان" کے فلم کے علاوہ زبیدہ بھی عالم رقص وغنا میں دکھائی جائے گی۔ ہر چند

میرے لئے اب اگر کوئی جگہ تفریح کی ہے تو وہ صرف عکاسخانہ ہے، لیکن میں کبھی تماشہ میں شریک نہیں ہوتا جبتک اس کا نام اور فلم کا عنوان مجھے متاثر نہ کرے۔ میں صبح ہی کو "بلبل پرستان" کا اشتہار دیکھ کر فیصلہ کر چکا تھا کہ نہیں جاؤں گا، کیونکہ اس کی بدذوقی نام سے ظاہر تھی اور یوں بھی ہندوستان کے بنے ہوئے فلم بہت کم اصول ڈرامہ نگاری اور صنعت فلم سازی کے لحاظ سے بے عیب ہوتے ہیں۔

لیکن ہمارے دوست .... جو باوجود ریش و بروت کے برف پوش ہونے کے "جوانی بہ دل ست نہ بہ سال" کے نہایت زبردست معتقد ہیں، اشتہار کے اس جملہ کی تاب نہ لا سکے:۔

"مصر کا بہترین حسن و شباب، عالم رقص و غنا میں"

ان کو جس بات نے زیادہ متاثر کیا وہ لفظ مصر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ غیر ملک کی ہر چیز کے ساتھ شوق جلد وابستہ ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ عورت اور عورت بھی جمیل! جوان!! رقاصہ!!! الغرض وہ صبح ہی دعوت دے گئے تھے کہ "آج کی شام ضائع کرنے والی نہیں"۔ اور میں بھی مضمحل سا وعدہ کر چکا تھا۔

شام کو اُن کے آنے میں جس قدر زیادہ دیر ہوتی جاتی تھی میں خوش ہو رہا تھا کہ شائد کسی خاص وجہ سے وہ نہ آسکیں گے۔ لیکن آخر کار میرے تخلیہ میں ان کی نرم لیکن سخت غیر شاعرانہ آواز نے اضطراب پیدا کر ہی دیا اور میں بادل ناخواستہ اُن کے ساتھ ہو گیا۔

ہجوم غیر معمولی تھا اور ٹکٹ لینے کی کھڑکی پر سخت جاہلانہ لیکن خالص ہندوستانی ذوق کی کشاکش جاری تھی، میں نے اس فرض سے عہدہ بر آ ہونا اپنے عزیز دوست ہی کے سپرد کیا اور سوچنے لگا کہ دنیا کیوں ایک معمولی رقاصہ کے لئے اس قدر بیتاب ہے ــــــ کیا اسلئے کہ وہ بہت جمیل ہے؟ لیکن ابھی تو اسے کسی نے دیکھا بھی نہیں ــــــ کیا اس لئے کہ وہ جوانی کا کوئی نادر مجسمہ ہے؟ مگر اسکا یقین کیونکر ہوا؟ تو پھر کیا صرف اسلئے کہ وہ رقص و موسیقی کی ماہر ہے، لیکن اگر یہ درست ہو بھی تو اسکا صحیح ذوق کسے؟

ایک غیر مسموع آواز نے کہا کہ جس طرح اب سے سے سیکڑوں سال پہلے ایک مرد عورت کے لئے بیتاب رہتا تھا اسی طرح اب بھی ہے اور ابدالآباد تک وہ اس کے نظارہ سے

سیر نہیں ہو سکتا کیونکہ قدرت بھی اپنی روحانی کاروبار کو بغیر عورت کی مدد کے نہ چلا سکی۔ فلسفی لاکھ کہا کریں کہ جنت نام ہے صرف اس جگہ کا جہاں کوئی آزار نہ ہو، مذہب تو یہی کہتا ہے کہ نیک کام کرو اور حوریں لو، یعنی ہر گناہ سے باز رہنے کا صلہ اس طرح دیا جائیگا کہ وہاں یہاں سے زیادہ بہتر موقع گناہ کرنے کا ملے گا! ہاں عورت گناہ ہے، سراپا معصیت ہے، لیکن کس قدر دلکش گناہ، کیسی لذیذ معصیت کہ آخرکار مذہب کے لئے بھی اس معصیت کا نظرانداز کرنا ضروری ہو ہی گیا۔ رہا مرد سو اس کے غیر اہم ہونے کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ یہاں کی عورتوں کے لئے ان کے اعمال نیک کے عوض میں فردوس و کوثر، طوبیٰ و سلسبیل اور خدا جانے کس کس چیز کا وعدہ کیا گیا، لیکن مرد کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ لاکھوں کروروں حوریں بنانے والے کے لئے صرف ایک مرد بنانے کے لئے فرصت کا نہ ہونا عجیب و غریب معمّہ ہے! شاید اس لئے کہ یہ امر خطرہ سے خالی نہ تھا، خیر، بہر حال میرا دماغ انھیں مختلف خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ میرے رفیق آ گئے اور میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا جہاں

انھوں نے بیٹھنا پسند کیا۔ پندرہ منٹ تماشہ شروع ہونے کو باقی تھے اور تمام خالی جگہیں نہایت تیزی سے پُر ہوتی جارہی تھیں، ہال کا ایک گوشہ پردہ سے گھرا ہوا تھا اور ہر شخص اس حصار کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ زبیدہ مردوں کی حریص نگاہوں سے بچی ہوئی یہیں مصروف آرائش تھی۔ سوا چھ ہوئے، گھنٹی کی آواز سُن کر دربانوں نے سیاہ پردوں کو دروازوں پر کھینچا، پیانو کی دلکش آواز ہال میں گونجی اور اس کے دو منٹ بعد جب ترانۂ خیر مقدم ختم ہوا تو روشنیاں گل ہوگئیں اور بلبل پرستان کا وہ فلم شروع ہوا جس میں زبیدہ نے بھی کام کیا ہے۔

یہ تماشہ افسانہ ہونے کے لحاظ سے بالکل لغو اور ڈرامہ نگاری کے اصول سے یکسر مہمل ہے، فن تصویر کشی بھی کسی جگہ تکمیل کے ساتھ نہیں دکھایا گیا اور تمثیل (ایکٹنگ) کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ اس لحاظ سے ہندوستان کے اسٹیج کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ——— اگر میں صرف فلم دیکھنے کے لئے آتا تو شائد اٹھ کر چلا آتا لیکن مقصود چونکہ اور تھا اور یہ فرصت دل کا خون ہی

کرنے کے لئے نکالی گئی تھی اس لئے بیٹھا رہا اور خدا خدا کر کے تیس منٹ طے ہوئے۔

دوسری ریل ختم ہوتے ہی ہال روشنی سے جگمگا اٹھا۔ سازندوں نے ساز چھیڑا اوپر سے بریقہ (SEARCHLIGHT) کی تیز شعاعوں نے اسٹیج پر سیلاب نور جاری کر دیا۔ پردہ کے چھلے آہستہ آہستہ ایک جانب سرکے اور تھوڑے وقفہ کے بعد:۔

.... نظر آیا

"اک نگار آتشیں رخ سر کھلا"

رات کا وقت، بجلی کی روشنی، بریقہ کی رنگین نور پاشیاں، صرف انھیں کا اجتماع انسان کے حواس کو مسحور کرنے کے لئے کافی ہے چہ جائیکہ اُن کے ساتھ واقعی معنی میں کوئی حُسن و شباب بھی شامل ہو جائے، کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں انسان خدا کو بھول جاتا ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک خدا کے پاس اس سے زیادہ زبردست دلیل اپنے وجود کو تسلیم کرانے کے لئے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ اس نے عورت ایسی چیز پیدا کی۔

زبیدہ (جو اس وقت اسٹیج پر تمام اُن فنون دلربائی کے ساتھ جو انتہائی تکمیل کے بعد ایک عورت کی طرف سے پیش کئے جا سکتے ہیں جلوہ گر ہے) تختۂ بازار ہی کا ایک پھول ہے، جس کی خوشبو بجائے شامہ کے لامسہ سے حاصل کی جاتی ہے، لیکن اُس وقت سے کہ وہ اپنے حجلہ گاہ سے نکلی، اُس لمحہ تک کہ پھر وہ سمٹتی ہوئی سی اندر داخل ہوئی، میں نے اُس کو اس قدر بلند چیز پایا کہ اس کے اظہار کے لئے "باندازۂ تاثر" الفاظ کی کمی محسوس کرتا ہوں۔

یہ خیال میرے دل میں اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ وہ غیر معمولی حسین ہے (حالانکہ ہے) نہ اس بنا پر کہ وہ فن رقص کی بہت بڑی ماہر ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ ایک بازاری عورت مشکل سے آرٹ کی صحیح روح کو اس قدر تکمیل کے ساتھ سمجھ سکتی ہے جس قدر اُس نے اپنے رقص و غنا کے دوران میں ثابت کیا۔

آرٹ چونکہ فطرت کی اصلاح ہے اس لئے تصنع و تکلف ہے، پھر کسی تصنع کو اس قدر حُسن کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ تصنع نہ معلوم ہو

ارتقاء کا وہ درجہ ہے جس کے نمونے اکثر نظر آجاتے ہیں لیکن اس ارتقاء کا دوسرا درجہ کہ تصنع ہی عین فطرت نظر آنے لگے یا ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ شائد فطرت اسی آرٹ کی محتاج تھی بہت بلند چیز ہے اور اس کی مثالیں دنیا میں کم نظر آتی ہیں۔

زبیدہ نے آرائش ملبوس کے لحاظ سے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی، وہی جسم کو اور عریاں کر دینے والا ہلکے رنگ کا ریشم، وہی آنکھوں کو خیرہ کر کے جلد میں اپنے آب و تاب کے انعکاس سے خاص قسم کی "مینائیت" پیدا کر دینے والا بادلہ، جو عام طور پر نظر آتا ہے وہ یہاں بھی تھا۔ اسی کے ساتھ چہرہ کا غازہ، رخسار کی گلگونی، لبوں کی سرخی، آنکھوں کی گہری سرگینی، بالوں کی متوجی آرائش یہ بھی کوئی غیر معمولی چیز نہ تھی لیکن جو ادا اُس کو عام سطح سے بلند کر رہی تھی، جو خصوصیت میرے سرکش دل و دماغ میں فتادگی پر فتادگی پیدا کرتی چلی جا رہی تھی، جو منظر میرے سوئے ہوئے جذبات میں اضطراب انگیز بیداری پیدا کرتا جا رہا تھا، وہ کیفیت جو میرے ذوق نقد کو غیر معمولی قوت تجزیہ عطا کر رہی تھی ظاہری نقش و نگار سے متعلق نہ تھی بلکہ وہ وابستہ

تھی، اُس کی خود دارانہ اداؤں سے، اُس کی سنجیدہ رعنائیوں سے اور خدا جانے کن کن باتوں سے جن کے لئے ابھی تک دنیا باوجود اس قدر ترقی کرنے کے کوئی لفظ وضع نہیں کر سکی۔

اس کی وہ آنکھیں جو بیک وقت مست بھی تھیں اور ہوشیار بھی اپنی ساحرانہ کارفرمائیوں کی انتہائی قوت اور نشہ بخش کیفیتوں کی تمام لذتوں کے ساتھ ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں جو کم از کم اس عالم کی چیز نہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ خود نشۂ حُسن سے معمور تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں صہبا کا ایک عمیق سمندر ہیں جن میں پتلی حباب کی طرح ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتی —— بار بار گردش مستانہ کے ساتھ اس کی پتلیوں کا اوپر کی طرف چڑھ جانا، ممکن ہے کہ اس کی اختیاری حرکت ہو لیکن اس اختیار کو وہ اس درجہ بے اختیارانہ، بیخودانہ اور مستانہ انداز سے استعمال کر رہی تھی کہ سخت سے سخت نقاد بھی اس میں کسی تصنع کا شائبہ نہ پا سکتا تھا —— وہ معمولی رقص کرنے والیوں کی طرح بار بار بیجا طور پر اپنی ابروؤں میں جنبش پیدا ہونے نہیں دیتی تھی۔ وہ خواہ مخواہ اپنی

گردن میں کوئی ایسا خم پیدا نہیں کرتی تھی جس سے کوئی قصد و ارادہ ظاہر ہوتا ہو، وہ کوئی غیر معصوم نفرت دلانے والا اہتزاز اپنی کمر میں نمودار نہ ہونے دیتی تھی، ہنگام رقص اس سے کوئی ادا ایسی ظاہر نہ ہوتی تھی جسے ہم ترک متانت کی کھلی ہوئی دعوت کہہ سکیں، اس کے خد و خال، لب و ابرو، چشم و پیشانی میں کسی وقت کوئی غیر نسائی یا فنی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی اور باوجود ایک غیر سنجیدہ فن اختیار کرنے کے حد درجہ متین اور باوصف بازاری حسن ہونے کے بالکل "خاصہ" کی چیز معلوم ہوتی تھی!

ایک عورت کے قد و قامت، انداز و ادا، نشست و برخاست، رفتار و گفتار الغرض آپ اس کی جس چیز پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورت کی تعمیر میں زیادہ تر کیفیات سے کام لیا گیا ہے اور کیفیات بھی وہ جن کا تعلق زیادہ تر مناظر کے نقاشانہ رُخ سے ہے نقاشانہ رُخ کیا؟ پہلے اس کو سمجھ لیجئے ——— ہر وہ منظر جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے یا تو وہ نہایت سادہ، مستقیم اور آسان قسم کا ہوتا ہے کہ نظر و دماغ کو اس کے دیکھنے اور سمجھنے میں

ایک سیدھے مقررہ خط سے ہٹ کر ادھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً سیدھی سڑک، صاف، آسمان، ساکن دریا، یا پھر وہ دقیق اور متنوع ہوتا ہے جیسے متموج دریا، پیچیدہ راستہ، ناہموار سلسلۂ کوہستان۔ پہلی قسم بالکل ابتدائی چیز ہے اور دوسری فنی اور اسی کو میں نقاشانہ رُخ کہتا ہوں۔

معمولی مناظر میں فطرت صرف خطوط مستقیم سے کام لیتی ہے لیکن فنی مناظر کے خطوط میں اعوجاج و انحناء ہوتا ہے، لوچ اور بانکپن ہوتا ہے اور اسی لئے میں نے کہا کہ عورت کی تعمیر میں جن کیفیات سے کام لیا گیا ہے وہ یکسر نقاشانہ ہیں اور اُن میں خطوط مستقیم سے پیدا ہونے والی کیفیات کو بالکل دخل نہیں ہے۔

زبیدہ میں ناگن کا بل تھا اور لہروں کا لوچ، گلبن کی لچک تھی اور سنبل کا پیچ و خم، کیونکہ میرے نزدیک وہ سر سے لیکر پاؤں تک ایک فنی شاہکار تھی قدرت کے اس اختراع و ابداع کی جسکا قیاس بھی انسان کبھی نہ کرسکتا اگر عورت کی آفرینش نہ ہوتی!

ایک شاعر کو اگر قوت تخلیق عطا ہو جائے تو وہ اپنے فکر و خیال کے

مطابق زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ بلور یا ہیرے میں نرمی اور لوچ پیدا کر کے اس سے کوئی پیکر بنائے اور اس میں گلابی رنگ بھر دے بالوں کے لئے مشک و عنبر کا انتخاب کرے، اسی طرح پھولوں کی خوشبو چاند کی روشنی، شبنم کی تازگی، شراب کی کیفیت، موتی کی آب و تاب اور تمام وہ چیزیں جن میں لطافت، نظافت اور نعومت (نزاکت، پاکیزگی نرمی) بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے، فراہم کرے اور اس کی تعمیر میں صرف کر دے لیکن حقیقتاً عورت اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے اور میرے نزدیک اس کا وجود ان تمام تشبیہات واستعارات کی دنیا سے بلند اور شرح و تفسیر کی دسترس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کا چہرہ بہترین یونانی ساخت کا تھا جس کو ہم ایک کلی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، اس کی آنکھیں جن کی پتلیاں شعلۂ سیاہ کی طرح پھڑکتی ہوئی نظر آتی تھیں بے انتہا حسین تھیں، اس کے جسم میں تناسب و رعنائی کمال حد تک پائی جاتی تھی، اس کا موسم اپنے شباب کے لحاظ سے وہی کیفیت پیش کر رہا تھا جو مینا کے اندر بادۂ سرجوش۔ اس کے حرکات رقصیہ کا

وہی اثر ہوتا تھا جو کسی سحر یا معجزہ کا ہو سکتا ہے، اس کی آواز میں ایسی نزاکت تھی کہ اس کا ایک ایک بول یہ معلوم ہوتا تھا کہ قطراتِ نور ہیں جو کسی ظرفِ سیمیں میں گر کر سماوی لحن پیدا کر رہے ہیں الغرض وہ اپنے سراپا کے لحاظ سے بالکل نور کی ڈھلی ہوئی پتلی اور اپنے فن کے لحاظ سے عہد فراعنہ کی کوئی ساحرہ معلوم ہوتی تھی، لیکن میں جس بات سے متاثر ہوا وہ ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔

بلکہ وہ صرف اُس کا علوئے ذوق تھا، اس کی ایک دیوی کی سی سنجیدگی تھی، اس کا پندارِ کمال تھا، اس کا وقارِ نسائیت اور ان سب سے زیادہ اس کے خد و خال کی ایک خاص کیفیت تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں صرف محبت کرنے اور محبت کئے جانے ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی ہستی ایک ایسی زبردست دعوتِ عشق تھی کہ میں مشکل سے کوئی پوری نگاہ اس پر صرف کر سکتا تھا۔

میں کانپ رہا تھا، میرے جسم کا ایک ایک ریشہ کانپ رہا تھا، اور میری روح! یہ معلوم ہوتا تھا کہ آہ

بن کر نکل جانے والی ہے۔!

از ماہ تا بہ ماہی

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

۶ ـــــــــــــ

آج صبح ہی سے ایک خاص قسم کی خستگی محسوس کر رہا ہوں، جسم کی نہیں روح کی۔ موسم کا تقاضا ہے کہ بسنت کی حسین دیوی کے شگفتہ قہقہوں کا لطف اُٹھاؤں، اس کے زرد آنچل کو ہوا میں اُڑتا ہوا دیکھ کر اس کا تعاقب کروں، اور گزر جانے والے موسم سرما کی تمام غیر شاعرانہ کیفیات کو محو کر کے بہار کی نزاکتوں اور رعنائیوں کی حضور میں تجدید محبت کروں اور اس سے بھی زیادہ وہ کروں جس کی ترغیب میں خیام کا یہ مصرع پیش کیا جاتا ہے:۔

"زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

کیونکہ جب فضا رنگ و بو سے بھر جائے، ہوا جب چنگ و رباب

چھیڑنے لگے تو دنیا بھی عبیر و گلال ہی سے کھیلنا پسند کرتی ہے اس کا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ اپنے اندر اہتزاز رقص پیدا کرے لیکن یہ بات نہ کہنے کی ہے نہ سُننے کی کہ ایک حزین روح بھی نہایت نازک دیوی ہے، طبیعت کا ملال بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے، اور ٹوٹے ہوئے دل کی صدا بھی ایک مستقل نغمہ و سرود ہے۔

دنیا کی آبادی بلحاظ احساس دو قابل ذکر جماعتوں میں منقسم ہے ایک طربیہ یا متفاول (OPTIMISTIC) جو فلسفۂ خیام کی مقلد ہے اور وعدۂ فردا پر لذت امروز کو قربان کرنا پسند نہیں کرتی۔ دوسری حُزنیہ یا متشائم (PESSIMISTIC) جو ہر بات کے ملول و حزین رُخ کو سامنے رکھ کر نشاطِ حاضر کو بھی نظرانداز کر دیتی ہے، وہ پھول کو دیکھ کر قہقہہ و خندہ سے تعبیر کرتی ہے یہ اسے صرف ایک زخم سمجھتی ہے، وہ نسیم کو زمزمۂ محبت خیال کرتی ہے اور یہ اُسکو صرف آہ جانتی ہے۔ ایک ایرانی ادیب عباس شاہ صفوی کے باغ کی تعریف کرتا ہوا صبح و شفق کی تعبیر ایک نہایت ہی لطیف مگر طربیہ استعارہ کی صورت میں اس طرح کرتا ہے کہ:-

"صبح نسیمے ست از فسترن زارش گزشتہ وشفق ہوائے ست ازالہ زارش برگشتہ"۔ لیکن اسی منظر کے متعلق دوسری جماعت کے ادیب سے پوچھو تو وہ صبح کو "چہرۂ پریدہ رنگ" اور شفق کو "دامنِ خونیں زیرِ سنگ" کہہ دیگا۔

عالمِ وجود یکسر مناظر ومرایا سے مرکب ہے اور یہ وہ نشانات ہیں جن کی تعبیر ہر شخص اپنے ذہن وتصور کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہے۔ آگ روشن ہو کر چاروں طرف فضا کو منور کر دیتی ہے، ایتھر وہی ہے لیکن شعلہ کا انعکاس اسے رنگین بنائے ہوئے ہے۔ سطحی نگاہ سے دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ہوا رنگین ہے۔ حالانکہ رنگ ہوا میں کہاں، شفق چہرۂ آفتاب کا صرف آئینہ ہے، لیکن دنیا نے اس کا ایک علیحدہ نام رکھ دیا۔ یہی وہ تاثرات تھے جن کی بنا پر بیدل یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

بیدل آں گوہرِ نایاب سراغ | بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ درآئینۂ ہوش | گل تواں گفت ولے چیدن نیست

میں انھیں خیالات میں محو تھا کہ میرے ایک گم گشتہ دوست کی تحریر

دوپہر کی ڈاک سے موصول ہوئی، لکھا تھا:۔

" بمبئی آئے اور اس چیز کو جسے آپ نے فتحپور کی ویرانیوں میں گم کیا تھا، ساحل قلابہ پر ڈھونڈھ لیجئے۔ جس وقت آخری بار میں آپ سے ملا تھا اس کے بعد سے دنیا کے ساتھ میں بھی بقدر دہ سال ضعیف ہو گیا ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ شباب میرا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہیں ——— اگر حُسن کی پیداوار جاری ہے تو سمجھ لیجئے کہ میری بست سالگی بھی ایک مستقل بالذات جوہر غیر فانی ہو کر رہ گئی ہے۔ آپکو یقین نہ آئیگا، لیکن میرا تجربہ ہے کہ جس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے رہئیے اس میں ترقی ہوتی رہے گی۔ زکوٰۃِ حسن سے افزونیِ جمال کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن شباب کے باب میں اس مسئلہ کی صداقت پر مجھے کامل اعتقاد ہے۔ آپ کہیں گے کہ ایک جنگ کے بعد میں نے آپ پر اثبات وجود بھی کیا تو اس انداز سے۔ لیکن کیا کروں۔ آپ کو یاد کرنے کی فرصت مل گئی ہے تو جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس لطف سے بیگانہ

رکھوں جو مجھ پر ایک نشہ کی طرح طاری ہے، غالب کی اس حسرت کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔

"کجا زہرۂ صبح و جامِ بلور"

اور یقیناً یہ اجتماع بڑی "خداساز" بات سمجھی جاتی ہے (مذہب اس زندگی میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا) اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کی شکایت بھی کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو چیز ترکِ اسلام کے بعد حاصل ہوسکتی ہے وہ ترکِ اسلام کے بعد ہی ملے گی۔ یہاں نہ کوئی دعا تھی نہ اسکے رد و قبول کا جھگڑا، صرف فکر فضول تھی اور جراءت رندانہ "پھر کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا کہ" زہرۂ صبح بھی ہے اور جامِ بلور بھی"۔ "ماہ چہاردہم بھی ہے اور بادۂ انگور بھی"۔

آپ کو یاد ہوگا وہ وقت جب میں ساری دنیا کا غم دل میں لئے ہوئے تڑپتا رہتا تھا، لیکن اب کائنات کو فراموش کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ دنیا نام ہے صرف اپنا اور "اُن" کا — "ہمیں جائے من و جائے تو باشد"! کیا آپ کبھی میرا یہ احسان

فراموش کر سکتے ہیں کہ میں نے اس عالم میں بھی آپ کو یاد کیا!

اس دس سال کے زمانہ میں مجھ پر کیا گزر گئی آسمان کا ایک ایک ستارہ اس سے واقف ہے، فضائے بسیط اس داستان درد سے شائد اب بھی لبریز ہوگی، اگر آپ اس نوائے راز کے محرم ہوں تو سُن لیجیے، سمجھ لیجیے، مجھے اس کے اعادہ و تکرار پر مجبور نہ کیجیے، مجھ سے تو اب صرف یہ پوچھیے کہ "جب ساری دنیا سوتی ہوتی ہے تو تو کیا کرتا ہے"۔ میر کی طرح میں آہیں نہیں کرتا، کروٹیں نہیں بدلتا، آنسو نہیں بہاتا ———— میں جاگتا رہتا ہوں، میرا طالع جاگتا رہتا ہے، نہ سوتا ہوں، نہ سونے دیتا ہوں ہنستا ہوں، ہنساتا ہوں، مجروح ہوتا ہوں، مجروح کرتا ہوں، یہاں تک کہ میری دنیا میں جب صبح کا آفتاب دن کو بارہ بجے طلوع ہوتا ہے تو اس وقت بھی کوئی ریشمی معطر چادر میرے سر پر کھینچ کر ڈال دیتا ہے اور میں پھر غافل ہو جاتا ہوں ———— "دیدیم کہ باقی ست

شبِ فتنہ غنودیم"

ذرا صبر کیجئے میں آپ کو ابھی اور جلانا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، جب ہم آپ کسی وقت ایک "رند شاہد باز" کی فرضی تصویر کھینچ کر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے ــــ مجھے خبر نہیں آپ کس عالم میں ہیں، لیکن باور کیجئے کہ عملی دنیا میں آنے کے بعد ہی یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا خیال بھی اُس ادا کی حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا جو بے اختیارانہ طور پر ــــــ تمام وہ قیامتیں جو ابھی تک ابد میں پوشیدہ ہیں کسی کے لب یا جنبش چشم و ابرو سے نکل کر دل کو مسحور کر لیتی ہیں ــــ ــــ خدا کی قسم رند ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے ــــ ــــ لوگ اپنی تباہیوں پر مذہبی تسکین کی جستجو کرتے ہیں جہاں لے دے کے بڑی کائنات "دعا" ہے یا "تقدیر" ــــــ ذرا ان دونوں کی بے تکی کو ملاحظہ کیجئے ــــ معاذ اللہ ــــــ اور پھر اسکے

بعد بھی سکون معلوم ———— برخلاف اس کے،
میری دنیا کے مراتب و مدارج کو ملاحظہ کیجئے کہ یہاں
ہر بربادی ایک ایثار ہے اور ہر ناکامی اعترافِ لطف
———— آپ ہی انصاف کیجئے کہ شکایت و شکر
میں کتنا تفاوت ہے ——— ایک وہ ہیں جو ظلم سے ڈرتے
ہیں اور ایک وہ جو ستم کو دعوت دیتے ہیں، اور ستم بھی
شدید ترین! آپ جانتے ہیں وہ کیا ہے؟ التفاتِ فراواں
———— لطفِ بسیار ———— اچھا اندازہ کیجئے ———— "وہ کافر
جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے" اگر صرف اپنی آغوش کے لئے
وقف ہو، تو کیا ہو؟ ———————— غالب کے
فلسفہ کے لحاظ سے یہ ہو کہ خدا بھی رشک کرے، دنیا کا کیا ذکر
ہے، اور میں ——— اب یہ نہ پوچھئے، میری بربادی کا یہ
افسانہ دیکھنے کی چیز ہے، سننے کی نہیں!

اب میں ختم کرتا ہوں، لیکن ایک بات اور سن لیجئے
———— نگاہِ اوّلیں کا افسانہ ہے ———— اس کی لذت کو

میں اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ خیر تفصیل کا موقع نہیں اور
نہ جراءت، مختصر کہنے میں خدا جانے آپ سمجھ سکیں یا نہیں۔
خیر، یوں سمجھئے کہ ـــــــ پیامِ روح تھا،
نویدِ فردوس تھا اور زیادہ غیر دلچسپ مذہبی زبان میں
اشارۂ غیبی تھا، الہامِ فطرت تھا ـــــــ ہاں لبوں سے
زیادہ پر لطف وہ بوسہ ہے جو ایک نگاہ جھک کر دوسری
نگاہ کو دیتی ہے۔ اسی کے یہ مختلف نام ہیں ـــــ آپ کو
جو پسند ہو انتخاب کر لیجئے، میں اسے صرف "خدا کو بھلا دینا"
کہتا ہوں۔ کیونکہ انتہائی لذت وہی ہے جس کی ابتدا اس
کیفیت سے ہو۔

شام کا وقت لیکن شفق سے شرابور، اُدھر سورج
ڈوب رہا تھا اور اِدھر ایک بدرِ کامل طلوع ہو رہا تھا،
اس کی چاندنی سمٹ کر ایک نقطہ میں تبدیل ہوئی اور پھر
بڑھ کر تار نظر میں، آپ کو شائد نہ معلوم ہو گا کہ اس ترکیب سے
جو پیکاں تیار ہوتا ہے وہ الٹ کر صاحبِ ترکش کو بھی

مجروح کردیتا ہے ــــــ یہ جراحت نام ہے اس
تبسم کا جو ہونٹوں پر نہیں بلکہ چیونٹوں پر نمایاں ہوتا ہے۔
ــــــ مجھے اس کا ہوش اُس وقت ہوا جب ساحلِ
قلابہ کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی ــــ
کہاں ؟ میرے پہلو میں، میری آغوش میں، میری نگاہ کے
سامنے، میرے لبوں سے نزدیک اور میری روح کے
اندر ــــــ یہاں تک کہ اب طلوع و غروب کا مفہوم
بدل کر صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ "ہیں" اور "نہیں ہیں" ۔
ــــــ ہاں وہ رات جس کی صبح کا مفہوم سوائے
اس کے کچھ نہ تھا کہ "بوئے یاسمن باقی ست" ــــــ
میرے لئے قائم ہو کر رہ گئی ہے" میں نے یا کسی اور نے
زمین سے اس کی گردش سلب کرلی ہے۔ ہیئت کے
نظام کو بدل دیا ہے اور گرمی کی دوپہر کا آفتاب بھی
مجھ پر چاند کی خنک شعاعیں ڈالتا ہوا نظر آتا ہے ۔
"حکم بر ستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے،

یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے اور اگر میں برہم ہو جاؤں تو شائد خدا ساری دنیا سے بیزار ہو کر منہ موڑ لے ——— فرصت ہو تو آئیے اور دیکھ لیجئے کہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" زمین پر کیا کیا آفتیں ڈھا رہا ہے............................

یہ وقفہ آپ سمجھے، کیا تھا ——— میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ چپکے چپکے پشت کی طرف سے ایک ہاتھ سے آنکھیں بند کر لی گئیں اور دوسرے ہاتھ سے خط چھین لیا گیا ——— میری آنکھیں نازک حنائی انگلیوں کو چوم رہی تھیں اور ان کی نگاہیں تحریر کے ایک ایک حرف کو ——— ہاتھ آنکھ سے ہٹا کر ہونٹوں کو مسلتا ہوا خط چھین کر کوئی لے گیا لیکن مجھ پر ششرار تبسم برساتا ہوا۔ ——— اب آپ سے بھی باتیں کرنے کو جی نہیں

چاہتا، اجازت دیجئے تاکہ اس فضاء معطر میں آنکھیں بند
کرکے بیہوش ہو جاؤں ـــــــــــ

آپ کا

آپ سے باہر

....

پورے دس سال کے بعد افضال کی یہ تحریر مجھے ملی۔ اس زمانہ میں مجھے اور اس کے تمام احباب کو یقین ہو گیا تھا کہ یا تو وہ مر گیا ہے یا ہندوستان سے باہر کسی دور دراز مقام کو چلا گیا ہے، اس لئے مجھے اس کا خط دیکھ کر بہت مسرت ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے میرا حزن و ملال دور ہو گیا۔ اس وقت اُس کی تمام باتیں ایک ایک کرکے مجھے یاد آرہی تھیں اور اس کی تمام وہ رعنائیاں اور خوش ادائیاں جن کو دیکھ کر میں "جواں مرگی" کی پیشین گوئی عرصہ ہوا کر چکا تھا۔ نگاہوں کے سامنے تھیں ـــــــــ آخر کار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا، اس سے زیادہ "جواں مرگی" اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کے لئے صرف ایک نگاہ اداشناس کی ضرورت ہے

اور اگر کبھی کوئی ہستی ایسی مل گئی تو نہ اسے زندہ چھوڑ سکتی ہے، نہ خود عرصہ تک زندہ رہ سکتی ہے۔

اِس وقت میں بیقرار تھا کہ کسی طرح اس کی گزشتہ زندگی کی ساری داستان سُن سکتا۔ گھڑی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی ایکسپرس کے روانہ ہونے میں ایک گھنٹہ کی دیر ہے۔ فوراً ایک ضروری تار لکھا کہ: "صبح کو پہونچوں گا" اور سامان سفر کی تیاری میں مصروف ہوگیا

۲

رُخ بتماشہ گہ ناز آورم

میں پھر اسی بلدۂ شعر و موسیقی کی طرف جا رہا ہوں، جہاں اب سے پانچ سال قبل، صحیح معنی میں اس ایک نگاہ کو دیکھا تھا، "جو بظاہر نگاہ سے کم تھی" ——— طبیعیات میں نگاہ 'ایتھر' کا اہتزاز و تموج ہو یا اس کا انعکاس، لیکن مجھ سے پوچھیے تو میں کہوں گا کہ وہ صرف کیفیت ہے روح کی، پیام ہے قلب کا، کبھی فرمان کی

صورت میں اور کبھی التجا کے رنگ میں ـــــــ غالب نے انتہائی نزاکتِ خیال سے کام لیا کہ ریاضی سے کام لے کر اس کو "نیم" یا "ربع" میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ "بظاہر" کہہ کر گویا یہ بھی بتادیا کہ ممکن ہے وہ بلحاظ ادائے حُسن و لطف کیف پوری "نگاہ" ہو اور ہم "باندازۂ شوق" اُسے "کم" سمجھتے ہوں ـــــــ سوادِ بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کر کے تمام اُن کیفیات کی یاد ستانے لگی، جن کو ہر چند میں بُھلا تو چکا ہوں لیکن اس بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتا۔

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی　　گر دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا

بہت دن ہوئے ایک شام کا واقعہ ہے:۔

ساحلِ آب پر خاموش تنہا بیٹھا ہوا قدرت کی اس عظمت و جبروت کا مطالعہ کر رہا ہوں جس کا نام سمندر ہے ـــــــ حدِ نظر تک سوائے اس ایک ہیجانِ سیال کے اور کچھ نظر نہ آنا، شب و روز لاکھوں کرور دل سال سے اسی طرح اس کا متلاطم رہنا ـــــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت اپنے آپ کو زمان و مکان سے آزاد کرنے کے لئے

مضطرب و بے تاب ہے۔ میں دیر تک اس متشکل "لانہایت" اس مرئی "ابدیت" پر غور کرتا رہا اور پھر کائنات کی اس بسیط فضا کا خیال کر کے جس میں ہمارا سارا نظام شمسی ایک جگنو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، حقیر ترین کرۂ زمین کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اس کی ارب در ارب آبادی میں اپنی ہستی پر غور کیا تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ جس طرح خوردبینی جراثیم ہمارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس سے زیادہ بے حقیقت ہستی انسان کی فطرت کی نگاہ میں ہے، پھر اس کے لئے حشر و نشر کا اہتمام، عذاب ثواب کا طومار، بہشت و دوزخ کا قصہ، آخر کیوں؟ یہ سب مفروضات ہیں جن کے ذریعہ سے انسان اپنی ہستی کو متعین کرنا چاہتا ہے، حالانکہ عمان بسیط کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ اسکی رو میں کتنے خس و خاشاک بہہ کر کہاں چلے جاتے ہیں ——— بیدل اپنے مخصوص انداز بیان میں اسی خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے۔

چو حباب غیر لباس تو چہ توقع و چہ ہراس تو
نہ تو مانی و نہ قیاس تو چہ کشند جامۂ پیکرت

حباب جو اپنی ہستی کے لحاظ سے صرف ایک لباس ہے، اس کو توقع یا ہراس سے کیا واسطہ، جس وقت لباس اُتر گیا قصہ ختم ہو گیا، نہ جامہ رہا نہ کوئی پیکر ——

چاند افق سے بلند ہو چکا تھا اور اس کی زرد شعاعوں کا حزن و ملال فضا میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کرتا جا رہا تھا، آج اس کا چہرہ مجھے بہت غم آلود نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سامنے رو تو رہا ہو لیکن سر نہ اٹھائے —— سمندر میں اس کا انعکاس ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا —— جیسے کوئی نہا کر بال خشک کرنے کے بعد بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے —— اور چوپاٹی کے ساحل پر برقی فانوسوں کی پُرخم قطار ایسی نظر آ رہی تھی جیسے کسی گلے کا ہار، اور چونکہ وہاں کا ہنگامہ میری نگاہ و سماعت سے بہت دور تھا اس لئے یہ سارا منظر ایک اثیری (ETHEREAL) کیفیت رکھتا تھا —— میں ساحل پر لیٹ گیا اور دیر تک غور کرتا رہا کہ اس وسیع کائنات میں میرا وجود بھی وہی حکم رکھتا ہے جیسے ریگستان میں کسی کا نقشِ قدم کہ ہلکا سا ایک جھونکا اس کے لئے پیامِ فنا ہے۔

ستارے جھلملا رہے تھے اور ان کی روشنی کا قبض و بسط حاکی کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق گویا غالب کے اس مصرع کی تکرار کر رہا تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

میں بھی سمجھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا "ہاں کون ہوتا ہے؟——کس میں اتنی تاب ہے"——کہ دفعۃً قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی حزن و ملال پنہاں تھا گویا کسی نے یہ کہا:۔

"کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد"

میں اُٹھ کر اس طرف متوجہ ہونا ہی چاہتا تھا کہ کوئی ساحل سے پانی میں تھا اور تھوڑی دیر کے بعد موج کی اس آغوش میں جس کا ہلکا سا فشار بھی ہمیشہ کے لئے بیخبری کی نیند سلا دیتا ہے——صبح کو سمندر کی دیوی نے اُس نازنین کی روح کی قربانی قبول کر کے اسکے جسم کو پھر ساحل پر لا کر ڈال دیا۔ جستجو سے سوائے ایک ہار، ایک رومال اور ایک خط کے جس کو وہ ساحل ہی پر چھوڑ گئی تھی نہ کوئی اور چیز ملی نہ یہ پتہ چلا کہ وہ کون تھی——خط کا مضمون یہ تھا:۔

"اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا"

"تمہاری محبت طوفان کی طرح آئی اور میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی، ہائے وہ بھی کیا عالم کامرانی تھا کہ تمہاری محبت کی تمام لذتیں میرے لئے مخصوص تھیں اور میں ان کے اعتراف سے بھی عاجز تھی - ایک زمانہ گزر گیا- یہ میری زندگی کا وہ عہد تھا جسے میں نے ہمیشہ دورِ شراب سمجھا، یہاں تک کہ ہر نشہ کی طرح اس میں بھی زوال آیا، اس لئے نہیں کہ میں نے اسے رد کیا بلکہ اس وجہ سے کہ تمہارے جرعہ ہائے الفت اب میرے لئے مخصوص نہ تھے۔ پھر جس طرح وہ شراب آہستہ آہستہ "رسا" ہوئی تھی، اسی طرح رفتہ رفتہ وہ ایک "آب ناصاف" کی صورت اختیار کرنے لگی، یہاں تک کہ یہ "چشمۂ حیات" میرے لئے بالکل خشک ہو گیا اور تم باوجود میری انتہائی التجاؤں کے میری روح کی اس تشنگی کو بجھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے

اور آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ تمہارے بُت کے سامنے میری آنکھوں نے دل کا آخری قطرۂ خوں پیش کر دیا لیکن تمہارا وہ قاتل و خونیں تبسّم، جس کو میں پہلے صرف تبسّم محبت سمجھا تھا، اب بھی بدستور قائم تھا۔ آخر آخر میری صرف یہی ایک التجا تم سے رہ گئی تھی کہ خدا کے لئے تم مسکرانا چھوڑ دو۔ میں دردِ غم سے بیتاب اور تم متبسم! میں تمہاری بیوفائیوں اور بیدردیوں کی داستان سے لبریز اور تم متبسم! میں تڑپ رہی ہوں تم مسکرا رہے ہو، میں رو رہی ہوں، تم مسکرا رہے ہو، یا اللہ یہ کیا قیامت ہے! میں نے بارہا کہا کہ تم کو پاس وفا نہیں نہ ہو، تم مجھ سے بیزار ہو گئے ہو، مجھے گوارا، تم میری محبت کو ٹھکرانا چاہتے ہو مجھے منظور، لیکن میں یہ کیونکر برداشت کر سکتی ہوں کہ تم اپنے تبسم سے مجھے جھٹلاؤ، اپنی بے پروائی سے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرو۔

گزشتہ چھ ماہ کی زندگی میں تمہاری محبت کے عروج و

انحطاط کے جو منازل مجھ پر گزر چکے ہیں وہ ایسے معمولی نہیں کہ مجھے زندگی و موت میں کسی ایک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کرتے۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی آسکتا ہے کہ زندگی کو موت سے بدتر سمجھنے لگے تو چارۂ کار سوائے اس کے نہ تھا کہ میں موت کو ترجیح دیتی کیونکہ کم از کم یہاں پہونچکر مجھے تمھاری مسکراہٹ کے دیکھنے کا تو اندیشہ نہ تھا جس کی بوئے خون مجھے ہمیشہ لرزہ براندام کر دیتی تھی۔

تمھاری محبت کے اولین ہدایا جنھیں عزیز رکھنے کی کوشش میں آخر کار مجھے جان دینا بھی گوارا کرنا پڑا اسی دنیا میں چھوڑے جاتی ہوں جہاں ایک زمانے تک انھوں نے مجھے تڑپائے رکھا ——— یہ ہار جسے میرے دل کی دھڑکن نے خدا معلوم کس کس طرح بیقرار رکھا، اور یہ رومال جس میں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں، چھوڑے جاتی ہوں اسلئے

نہیں کہ آپ انھیں میری یادگار سمجھ کر محفوظ رکھ لیں، بلکہ
صرف اس غرض سے کہ جب آپ انھیں دیکھیں تو ایک
مرتبہ پھر مسکرا دیں۔ خدا کرے میری موت کی پہلی رات
آپ کی حیاتِ نشاط کا اولین نوروز ہو"۔

بدنصیب

ز۔ خ

یہ واقعہ بھی منجملہ اور بہت سے واقعات کے ہے جو میری سابق
سیاحت کی تلخی کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے ....

گاڑی جس وقت اسٹیشن پر پہونچی تو افضال پلیٹ فارم پر موجود
تھا، میں اُترا اور دیر تک اُسے دیکھتا رہا ——— میرے تصور نے
جو خیالی تصویر اس کی قائم کی تھی وہ یقیناً بہت مختلف تھی، میں سمجھتا تھا
کہ وہ بھی میری ہی طرح ایک افسردہ چہرہ، ایک مضمحل صورت رکھتا ہوگا
اور زمانے کے تلخ تجربات نے اس کے خدوخال پر بھی کافی نقوش

بولا "آپ کو معلوم ہے میں دنیا کو ہمیشہ قمار خانہ کہا کرتا تھا لیکن یہ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس میں بازی کس طرح لگانا چاہیئے کہ جیت اپنی رہے ——— میں اس دس سال کے عرصہ میں کامل چھ سال تک یورپ میں رہا اور وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ کھیل کس طرح کھیلا جاتا ہے، میں نے اس فن کو وہاں سیکھا، اور پھر اس کا علم صرف مجھی کو ہے کہ کس بیدردی کے ساتھ اپنے ضمیر، اپنے اخلاق و انسانیت یہاں تک کہ اپنی روح کی قربانی اس پر چڑھانے کے بعد میں نے اس فن کو حاصل کیا اور پھر چونکہ میں نے اسکو نہایت گراں قیمت دیکر حاصل کیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کو عزیز نہ سمجھوں اور اب اس کے نتائج سے متمتع نہ ہوں۔ یاد رکھیئے کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بھی اپنے اس کھیل سے دھوکا دینے میں دریغ نہ کروں گا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی تاسف نہ کروں گا اگر اپنے ذرا سے نفع کے لئے آپ کو بڑے سے بڑا نقصان کسی وقت پہنچا دوں"

میں نہایت حیرت سے اُس کی گفتگو سُن رہا تھا اور اسکا ہر فقرہ

چھوڑے ہوں گے لیکن وہ ہنوز ریحانِ شباب کی تصویر تھا، جوانی کی شگفتگی اس کے خد و خال سے ظاہر ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری ناکام زندگی کا انتقام دنیا کے ذرہ ذرہ سے لے رہا ہے۔

میں اس وقت سراپا استفہام تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ دس سال کی زندگی کا افسانہ بیک وقت مجھے سنا دے لیکن میں حیران تھا کہ کہاں سے سوال کی ابتدا کروں، وہ یہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور صرف مسکرا رہا تھا ——— آخرکار میں نے گھبرا کر ایک مرتبہ سوال کر ہی دیا کہ :-

"افضال خدا کے لئے بتاؤ تم کیا ہو، کون ہو، کہاں ہو؟"

وہ یہ سُن کر ایسے قہقہہ کے ساتھ جسمیں شراب کا نشہ ملا ہوتا ہے ہنسا اور بولا "آزاد ہوں، انسان ہوں، اور وہاں ہوں جہاں ہر شخص کی رسائی ناممکن ہے"۔

میں نے کہا۔ "خدا کے لئے عملی دنیا اور مادی عالم کی باتیں کرو تمہارے معمے کسی وقت فرصت سے بیٹھ کر حل کروں گا، اس وقت میری بے تابیاں اسکی متحمل نہیں ہو سکتیں"۔

میری نگاہ سے ایک حجاب اٹھتا جاتا تھا۔ موٹر آہستہ ہوکر ساحل قلابہ کی ایک شاندار کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا اور رواق (PORTICO) میں پہونچکر ٹھہر گیا۔ تمام احاطہ ــــــــ در و دیوار، محراب، زینہ، چھت، ستون غرض اس عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پھول ہی پھول نہ نظر آتے ہوں۔ سامنے نہایت ہی شگفتہ اور پاکیزہ خانہ باغ، محرابوں اور دیواروں پر خوشنما بیلیں، معلق گملے اور جا بجا خوبصورت چڑیوں کے پنجرے، یہ تھا وہ سب سے پہلا منظر جو سامنے آیا۔

خادم نے دروازہ کھولا اور افضال ایک ایسی شان کے ساتھ جس میں سرمایہ دارانہ تمکنت سے زیادہ ایک شاہانہ غرور پایا جاتا تھا، نیچے اُترا اور نرم ایرانی قالینوں کے فرش سے گزرتا ہوا مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جس کی پُر تکلف آرائش یقیناً جنت قلب و روح تھی۔ میں اپنے معمولی ملبوس اور دہقانی وضع میں بیٹھا ہوا خود اپنے کو بُرا معلوم ہو رہا تھا، اور بعض مرتبہ یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں افضال کو میرا آنا ناگوار نہ ہوا ہو ــــــــ افضال بھی

اسی کوچ پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور بولا کہ "فرمائیے آپ داستان سننے کے لئے نہیں بلکہ دیکھنے کے لئے کب تک تیار ہو سکیں گے؟"

اس کے چہرے کے نشاط اور بے اختیارانہ تبسم کو دیکھ کر اس کی وہ تحریر میری نگاہوں کے سامنے آگئی جس کو پڑھ کر میں یہاں آیا تھا، اور ان سب باتوں کو مربوط کرنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصود کیا تھا۔ میں نے نہایت ہی غیر محسوس طور پر اپنی حالت کا مطالعہ کیا اور بولا: "یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری داستان صرف سُن لی جائے۔"

وہ شروع ہی سے بے انتہا حساس تھا اور معمولی سی بات میں اس کی باریک جلد کے نیچے خون دوڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرۂ غیر معمولی طور پر رنگین ہو گیا اور نہایت ہلکی سی خشونت کے ساتھ بولا "ممکن ہے لیکن آپ کو یقین نہ آئے گا۔"

میں نے پھر اُسے مستفسرانہ انداز سے دیکھا، اب اس پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، نہایت بیخودانہ انداز سے بولا۔

"اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو

آپ یقین کرلیں گے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ چاند میری آغوش میں آگیا تو آپ کبھی باور نہ کریں گے، اسی طرح اگر میں یہ بیان کروں کہ شفق کی رنگینیاں، بہار کی عطر بیزیاں مجسّم ہوکر میرے پہلو میں آگئیں تو بھی آپ کو یقین نہ آئے گا ——— یونان کی دیوی زہرہ کا مجسّمہ مادی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت ہو سکتا ہے لیکن اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ——— اس پیکرِ سنگین میں کسی کے لئے کبھی جان بھی آسکتی ہے تو آپ کیا کوئی بھی اس کی تصدیق نہ کرے گا۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ میرا افسانہ سننے کی چیز ہے یا دیکھنے کی ؟"

افضال یوں تو ہمیشہ سے حسًّا و فکرًا شاعر تھا لیکن اب میں اسے مقال کے لحاظ سے بھی شاعر دیکھ رہا تھا۔ وہ گفتگو کر رہا تھا اور اس کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کے لحاظ سے وہ اپنے سینے کو بہت تنگ پاتا ہے ——— اس نے قریب کی میز سے شیشہ اُٹھا کر شراب انڈیلی اور میرے سامنے بڑھائی۔ میرے ہلکے تبسّم سے وہ میرے انکار کو سمجھ کر بغیر کسی مزید اصرار کے خود پی گیا اور میز پر گلاس رکھتے ہوئے یہ شعر نرم سُروں میں گنگنانے لگا:-

نخستین بادہ کاندر جام کردند
زچشم مستِ ساقی وام کردند

﴿ ۴ ﴾

امشب آتشیں روئے گرم ژند خوانیہاست
کز لبش نوا ہردم در شرر فشانیہاست

شیریں اس قسم کی حسین عورتوں میں تھی، جن کے چہرہ سے بہ نسبت حُسن ظاہر کے حُسن فطرت زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور دیکھنے والا بجائے مسحور ہونے کے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک ایسا عمیق چشمہ تھیں جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت اور مادیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی۔ اس کی صورت دیکھنے کے بعد ایک شخص ایسا محسوس کرتا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے جب اس سے گفتگو کی جاتی تو وہ اس طرح جواب دیتی جیسے کسی دور فاصلے سے کھینچکر اپنے آپ کو واپس لائی ہے اور جواب دے کر پھر

وہیں چلا جانا چاہتی ہے۔ ہر چند جب افضال سامنے ہوتا تو اس کا بہترین مشغلہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ وہ اس کی صورت کو دیکھا کرے تاہم اسوقت بھی اس کا انداز کچھ کھویا ہوا سا رہتا اور ایک نامعلوم جستجو اس وقت بھی اسکی چتون سے ظاہر ہوتی رہتی۔ اس نے جب اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے نقوش مجھے دکھائے تو میں نے اُن کے اندر یہی رنگ غالب پایا اور کوئی ایک نقش بھی ایسا نظر نہ آیا جسکو میں "خیال بیدار" کہہ سکتا۔ مناظر سے اُسے خاص دلچسپی تھی لیکن وہ بھی اس قسم کی، ساکن سطح آب، سنسان صحرا، خاموش شب ماہ، برف پوش چوٹیاں"۔ ذی حیات چیزوں کی تصویریں بنانے سے اُسے کم دلچسپی تھی اور کبھی ضرورتاً ماحول کے لحاظ سے بناتی بھی تو اس میں ایک حزن کی کیفیت پیدا کر دیتی۔

اس کا ایک نقش جس کو فرانس کی اکاڈیمی نے بہت سراہا تھا، وہ تھا جو "داستان خموش" کے عنوان سے پیش کیا گیا تھا۔ صبح کا وقت ہے۔ طلوع آفتاب سے قبل، رنگ کے لحاظ سے صحیح معنی میں طلبا شیر سحر، گلاب کی جھاڑی میں شاخ سے ٹوٹ کر گلاب کا مرجھایا ہوا پھول زمین پر

پڑا ہے اور بلبل اس کے پاس مر کر سرد ہو گئی ہے، منظر کے ماحول میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس حادثہ کے دیکھنے کے لئے جھکی پڑتی ہے"۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ کا خیال اس نقش کی طرف کیوں منتقل ہوا؟"

افضال بھی موجود تھا، وہ شیریں کو بہت دق کیا کرتا تھا فوراً بول اٹھا۔ "جس طرح اور بہت سی غیر حقیقی باتوں کی نمائش کے لئے ضرورتاً خیال کو منتقل کرنا پڑتا ہے"۔

شیریں جو اس کی اس قسم کی باتوں کی عادی تھی مسکرائی اور بولی کہ "یہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا کیونکہ اس نقش میں اگر کوئی جھوٹ حصّہ ہو سکتا ہے تو صرف بلبل کا جان دیدینا۔ پھول کا مرجھانا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، اور اس حصّہ کو خلاف واقعہ دکھانے میں میری مصلحت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ مدعیان محبت کے فریب پر پردہ ڈال دوں، ورنہ شائد آپ کو تکلیف ہوتی"۔

شیریں بہت ذہین تھی اور میرے نزدیک خطرناک حد تک

ذہین، لیکن خیریت یہ تھی کہ اس کا حمال ایک ایسی معصوم حقیقت تھا کہ وہ اس کی ذہنیت سے پیدا ہونے والے خطرات کو بھلا دیتا تھا اور انسان پھر بدستور خواب عشق میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

شیریں اور افضال کی شناسائی سب سے پہلے پیرس میں میں ہوئی اور رفتہ رفتہ اس قدر وسیع ہو گئی کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی دونوں جدا نہ ہو سکے۔ شیریں بمبئی میں ایک بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی اور سوسائٹی میں نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی قابلیت و شائستگی کے لحاظ سے بھی خاص عزت رکھتی تھی۔ افضال یوں تو بظاہر صرف سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن حقیقتاً وہ اس پہ مالکانہ اقتدار رکھتا تھا اور اس کا علم تقریباً سبھی کو تھا۔

یقیناً افضال ایک خوشرو انسان تھا اور تمام وہ دلربا ادائیں جو ایک حُسن مہذب کو مالوف کرنے کے لئے ایک مرد میں ہونی چاہیئے اس میں موجود تھیں لیکن پھر بھی یہ بات ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا کہ شیریں نے اسی کا انتخاب کیوں کیا۔ جب کہ افضال سے بہتر انسان اسکو مل سکتے تھے ـــــــ میرے ایک ہفتہ کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ

شیریں، افضال سے زیادہ اس کی ذہانت کی دلدادہ تھی، اس کے تیکھے پن کی فریفتہ تھی، وہ اس کے جلد برہم ہو جانے کی صلاحیت پر مٹی ہوئی تھی، اور چونکہ وہ خود ایک متاسل و خوابیدہ فطرت رکھتی تھی اسلئے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسے چونکاتا رہے، جگاتا رہے، اور افضال جو غالباً اس راز کو سمجھ گیا تھا پیدا ہی ہوا تھا چھیڑ اور شرارت کے لئے۔

شیریں کا معمول تھا کہ وہ ایک بات کا جواب دیکر سوچنے سی لگ جاتی اور دیر تک اس کی یہی حالت رہتی، لیکن اسوقت افضال کے فقرہ کا جواب دینے کے بعد بھی وہ آمادۂ گفتگو تھی اور اس کے ساتھ وہ صناعانہ جذبات جو زیادہ تر دماغ ہی کی فضا میں بند رہتے ہیں، آنکھوں کی چمک سے، لبوں کے ارتعاش سے، چہرہ کی سرخی سے جسم کی ہلکی بے چینی سے ٹپکے پڑتے تھے۔

افضال کو جواب دینے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ ایک نقش دیکھنے کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ سوال ایک نقاش کیلئے یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے ماخذ نقش، رفتار خیال، انتقال فکر کا سوال کیا جائے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک نقاش کے

نقوش، اوراق حیات ہیں، داستانِ زندگی ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خطوطِ نقش کے ذریعہ سے وہ دوسروں کا حال بیان کرنا چاہتا ہے اور اس صورت میں بعض اوقات دیکھنے والے کو نقاش کی فطرت کے سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، آپ نے جس نقش کو پسند کیا ہے وہ مجھے پسند نہیں کیونکہ اس میں بلبل کا وجود میرے ذوق کے منافی ہے، مرجھائے ہوئے پھول کے سامنے اس کا مردہ حالت میں پایا جانا گویا نقاش کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ نہ عشق حسن کی تاب لا سکتا ہے اور نہ حُسن عشق سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے، اس کے ساتھ کائنات کی توجہ گویا اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہر چند یہ حادثے نہایت معمولی ہیں لیکن حقیقت کے لحاظ سے کائنات کو ہلا ڈالنے والے ہیں۔ خیال بھی پامال ہے اور تصویر میں اس کا اظہار بھی معمولی بات ہے، اگر میں اکاڈیمی کے بعض ممبروں کے خیال سے آگاہ ہو کر یہ منظرِ نقش میں پیدا کرنے پر مجبور نہ ہوتی تو میں وہ نقش پیش کرتی جس کو میں نے انتظار کا عنوان دیا ہے، یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور الماری سے ایک تصویر نکال لائی جس کا یہ منظر تھا:۔

فضا ابر آلود ہے، شام کی تاریکی کافی پھیل چکی ہے اور ایک
نوجوان لڑکی اپنے جھونپڑے کے دروازے کھڑی ہوئی ہے
ابر کے ٹکڑوں اور بجلی کی چمک کو خوف و وحشت کے ساتھ
دیکھ رہی ہے، بجلی کی نورانی لکیروں اور بادلوں کے ٹکڑوں
سے ملا کر اس لڑکی نے انتہائے نظر پر ایک نہایت ہی ہلکی سی
مٹی ہوئی صورت اس شخص کی پیدا کی گئی ہے جس کے انتظار
میں وہ باہر نکل آئی ہے اور اس کے چہرہ سے گویا یہ خیال
ٹپک رہا ہے کہ "کیا اب بھی وہ نہ آئیں گے اور نہ آئے تو
یہ طوفانی رات کیوں کر بسر ہوگی"!

اس تصویر کو دیکھ کر میں متحیر رہ گیا۔ شیریں نے اس قدر شدید تاثرات اس میں بھر دئے تھے کہ میری آنکھیں نم آلود ہوگئیں اور میں اس طرف سے نگاہ ہٹا کر بالکل خاموش بیٹھ گیا، اس نے میری حالت کو سمجھ کر فوراً موضوع گفتگو بدل دیا اور افضال سے مخاطب ہو کر بولی :۔

"آپ کو یاد نہیں آج شام کو ماتھران چلنا ہے، مہربانی کر کے

سر فضل کریم بھائی کو ٹیلیفون کرکے دریافت کرلیجئے کہ جعفر کمپنی کے مسئلہ میں کل میری حاضری کی تو ضرورت نہ ہوگی"۔

افضال جو ایسے اوقات میں نہایت ہی مؤدب سکریٹری کی حیثیت اختیار کرلیتا تھا اُٹھا اور نہایت ادب سے جھک کر تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگیا۔

افضال کی یہ خصوصیت کہ موقع و محل کے لحاظ سے وہ اپنے اوپر متضاد و متباین کیفیات نہایت کامیابی کے ساتھ طاری کرلیا کرتا تھا اسقدر عجیب و غریب تھی کہ میں اس کے اس شعور پر حیران تھا، اوّل دن جب میں نے تنہائی کی ملاقاتوں میں افضل اور شیریں کی گفتگو کو سُنا تو حیران رہ گیا کہ شیریں اسکے لئے کس درجہ سراپا ایثار و سپردگی ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کس قدر شریر و گستاخ، لیکن جب دوسری صبح اس نے ڈرائنگ روم میں شیریں کی ڈاک اور کچھ کاغذات پیش کئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملک معظم کے سامنے کوئی اس کا سکریٹری مؤدب کھڑا ہوا احکام حاصل کررہا ہے۔ میں نے ایک دن افضال سے اسکے متعلق گفتگو کی تو اس نے کہا "آپ نہیں جانتے آج کل کی تہذیب

تعلیم یافتہ عورت کس قدر پیچیدہ معمہ ہے علی الخصوص اسوقت جب کہ دل کا معاملہ اس کے سپرد کیا جائے کہ پھر اس صورت میں تو اس کی نگہداشت ایک ناگن سے زیادہ کرنی پڑتی ہے' شیریں پر جو اقتدار مجھے حاصل ہے، نتیجہ ہے میری چار سال کی کوشش کا اور بڑی حد تک مجھے اس پر اعتماد ہونا چاہئے لیکن باور کیجئے' جس وقت میں اس عورت کو بات کرتے کرتے دفعتہً کسی غور و فکر میں مبتلا ہو جاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور میں ایک خاص انداز سے اس پر ظاہر کر دیتا ہوں کہ عورت خواہ کتنی ہی بڑی مدعی ایثار و قربانی کی کیوں نہ ہو لیکن میں اُس پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ سُن کر غالباً حیرت ہوگی کہ اس نے اتنے طویل عرصہ میں انتہائی لطف و مسرت کی گھڑیوں میں بھی کبھی میرے اس طرز عمل پر کوئی تنقید نہیں کی اور ایک بار بھی اُس نے یہ نہیں کہا کہ اس رسم کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک عورت ہر وقت عورت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ کبھی انسان بھی ہو جاتی ہے اور انسان بھی وہ جو صرف جذبات کے لئے جذبات ہی کے ذریعہ سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور کوئی فلسفۂ حیات اس کے

مشہور تھی کہ "شیریں کو دیکھ لینا، محبت کر لینا ہے اور محبت کر لینا تباہ و برباد ہو جانا" یہ تھا اس کے حُسن و دلربائی کا عالم اور اسی کے ساتھ اس کی خودداری اور تمکنت کا رکھ رکھاؤ

میں موسیو ژور ڈان کا مہمان تھا جو پیرس کا مسلم الثبوت ماہر علم الکیمیا ہے، میری اُس کی ملاقات کیوں کر ہوئی؟ یہ ایک اور داستان ہے، پھر کبھی سناؤں گا۔ بہر حال میں ژور ڈان کے پاس مقیم تھا، اور ایک امیر کے ہاں جو ژور ڈان کا قدیم دوست تھا، میں بھی ایک جلسۂ رقص میں مدعو تھا، پیرس کی تمام سوسائٹیوں کا گویا عطر کھنچکر اس جلسہ میں آگیا تھا، شیریں بھی وہاں تھی اور اس شان کے ساتھ کہ پیرس کی بڑی بڑی خوش وضع اور تیکھی عورتیں اس پر رشک کر رہی تھیں جب اوّل اوّل صاحب خانہ نے میرا تعارف اس سے کرایا اور اس نے ہاتھ ملایا تو انگلیوں کے مس ہوتے ہی اُس نے اپنا سب سے پہلا مشہور حربہ مجھ پر صرف کیا، اُس کی نرم و نازک انگلیاں میری ہتھیلی سے اس طرح آہستہ آہستہ گزر رہی تھیں گویا وہ کوئی پیام سنا رہی ہیں اور اُسکی نگاہیں اس قدر متین، رحم طلب اور روادارانہ انداز سے میری نگاہوں سے

سامنے نہیں ہوتا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ شیریں کے سمجھنے کے لئے میں نے اپنی انفرادیت کو کس قدر نا قابل فہم بنا دیا ہے، وہ میری فطرت کو سمجھنے کے لئے بہت غور کرتی ہے اور جب اس میں اُس کو کامیابی نہیں ہوتی تو اس میں ایک انفعال پیدا ہوتا ہے اور میرے اندر استغناء کامل!

آپ باور کیجئے کہ میری نگاہ سے اسقدر ذہین عورت نہیں گزری، خطرات قلب پر آگاہ ہو جانا اس کی ذہانت کا ادنےٰ کرشمہ ہے۔ لیکن خود ستائی نہ سمجھئے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مجھ سا انسان بھی اس نے کبھی کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ شیریں کا وہ زمانہ جب یہ پیرس میں تھی اس کی فتوحات کا عجیب و غریب زمانہ تھا، بڑے سے بڑا انسان جو اسکے دائرۂ تعارف میں آجاتا تھا، اس طرح بے بس ہو کر رہ جاتا تھا جیسے جالے میں پتنگا، اور پھر اسکی بے اعتنائیوں، بے دردیوں کا وہ عالم ہوتا تھا کہ خدا کی پناہ، وہاں کے تمام طبقوں کے لوگ اسکو قلوپطرۂ ہندؔ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ آپ کا وقت ضائع ہوگا لیکن میری اسکی اولین ملاقات کی داستان سننے کے قابل ہے، وہاں عام طور پر یہ بات

مل رہی تھیں جیسے انھوں نے کوئی اپنی دیرینہ آرزو پالی ہے۔ میں نے اس کو محسوس کیا اور یہ حالت ہوئی جیسے سیلاب میں کسی کے قدم اکھڑ جائیں، لیکن چونکہ میں پہلے ہی اس کی ان مار رکھنے والی اداؤں کا ذکر سُن چکا تھا اور یوں بھی کافی تجربہ اس طرح کی دلربائیوں کا رکھتا تھا اس لئے جب تک وہ اس سحر کاری میں مصروف رہی، میں اپنی حالت سے اس کو یہی یقین دلاتا رہا کہ اس کا حربہ خالی نہیں گیا۔ لیکن اس یقین کے بعد اس نے اپنے پندار میں مجھے نیم بسمل کر کے ہاتھ سے ہاتھ اور نگاہ سے نگاہ کو جدا کر کے منھ موڑا ہی تھا کہ میں ہنس پڑا۔ یعنی یہ میرا پہلا حربہ تھا جو میں نے اس کے خلاف استعمال کیا۔ یہ اسکی زندگی کا پہلا تجربہ تھا، اس لئے جب اُس نے منھ پھیر کر میری طرف دیکھا، تو میں نہایت ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ "معاف فرمایئے، کبھی دل کا تاثر بھی ہنسی پر مجبور کر دیتا ہے، خاص کر جب نشتر ہلکے قسم کا ہو، اس لئے الزام مجھ پر نہیں ہے"۔

وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی گویا اُسے اب بھی یقین نہ تھا کہ میں ہنسا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "کیا آپ مجھے اجازت دے سکتی

ہیں کہ میں آپ کو رقص گاہ تک پہنچا دوں"؟

اس نے تھوڑا سا تامل کر کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میں اسکو سہارا دیتا ہوا بڑھا۔ وہ خاموش تھی لیکن متفکرانہ، میں بھی خاموش تھا لیکن عیارانہ!

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے پھر دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو بیک وقت نشہ بخش بھی تھیں اور جرات آموز بھی۔ میں نے اُسے دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو ہر کیفیات سے خالی تھیں ———

اس کے بعد جلسہ کے دوران میں باوجود اس کی جستجو کے بھی میں اس سے نہ ملا اور جب اس کو کسی طرف سے آتے ہوئے دیکھا تو قصداً ہٹ گیا، اور اس انداز سے کہ وہ میرے احتراز کو سمجھ لے۔

دوسرے دن وہ موسیو ثر وروان کے مکان پر آئی، میں اُس سے ملا، لیکن ایک خود داری کے انداز سے اور پھر ایک خاص ضرورت کا بہانہ کر کے چلا گیا۔ اس نے میری نسبت موسیو ثر وروان سے بہت گفتگو کی، اور جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ چار پر بلا گئی ہے اور دوسرے دن دعوتی رقعہ بھی میرے نام کا آ گیا۔

ژوردان چونکہ اُس وقت بہت مصروف تھا اس لئے وہ نہ جاسکا اور تنہا مجھی کو جانا پڑا۔ شیریں کی دولت و امارت کا حال مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا لیکن اس کی جائے قیام پر جاکر مجھے اُسکی پاکیزگی ذوق اور وسعت مطالعہ کا حال بھی معلوم ہوا۔ اس صحبت میں جو گفتگو اُس سے ہوئی اُس کی تفصیل تو یاد نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جب میں اس سے رخصت ہوا ہوں تو اور زیادہ اس کے لئے معمّہ بن گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ جستجو و خلش تھی۔

اس کے بعد زمانہ گزرتا گیا، مراسم بڑھتے رہے تکلف دور ہوا، مختلف وقت و محل کی گفتگو نے مجھے اُس کے اور اُس کو میرے ذوق کے سمجھنے میں مدد دی لیکن جس حد تک رابطۂ جنسی کا تعلق ہے وہ میرے لئے چیستان تھی اور میں اس کے لئے عقدۂ مشکل۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ میں اس کے لئے اور اس میں میرے لئے خاص مرکزیت پیدا ہونے لگی اور اس کی دلچسپیاں محدود ہو کر رفتہ رفتہ صرف میری ذات سے متعلق ہو گئیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ہم دونوں گویا دو شعلے تھے جو علٰحدہ علٰحدہ جل رہے تھے اور باوجود شدید تمائل کے ایک

دوسرے کو چھو نہ سکتے تھے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ پہلی ملاقات کے دو ماہ بعد ہی میری خدمات ایک سکریٹری کی حیثیت سے اس نے حاصل کرلی تھیں اور اب میں شب و روز اسی کے ساتھ رہتا تھا۔

آپ یہ سُن کر حیرت کریں گے کہ کامل چار سال اسی عالم میں گزر گئے ہیں اور میں اپنی اس رہبانیت میں خاص قسم کی لذت محسوس کرنے لگا ہوں، ادھر اس کا یہ عالم ہوا کہ شوخیاں متانت میں، لہو ولعب سنجیدگی میں اور فرصت کے تمام اوقات نہایت عمیق غور و فکر میں بسر ہونے لگے۔ آپ اس کے اولین نقوش اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بعد کے نقوش سے وہ کس قدر متبائن ہیں۔ آپ کو جو خط میں نے لکھا تھا، ہرچند وہ بالکل حقیقت کے خلاف تھا لیکن میری تمنا کے بالکل موافق تھا، پہلے دن جب آپ آئے اُسوقت بھی میں نے آپ کو دھوکا دینا چاہا لیکن اب چونکہ اس مسئلہ میں آپ سے صحیح مشورہ کرلینا تھا، اس لئے ضرورتاً یہ سب بیان کرنا پڑا، دنیا جو چاہے سمجھے لیکن اس کو میں ہی جانتا ہوں کہ یہ برسوں کی الفت کس طرح اب تک ناشگفتہ حالت میں پڑی ہے۔ اگر اسوقت تک کی میری اس کی صحبتوں اور

خلوتوں کی گفتگو کو تحریر میں لے آیا جائے تو بہترین عاشقانہ لٹریچر فراہم ہو سکتا ہے لیکن حقیقت و معنی کے لحاظ سے شاید ہی کوئی دفتر اس سے زیادہ مہمل و لایعنی نظر آئے۔

شادی کا سوال براہ راست تو نہیں ضمنی طور پر بارہا پیدا ہوا لیکن آخر کار میں اور وہ دونوں اسی نتیجہ پر پہنچے کہ شادی نام ہے صرف باہمی غلط فہمی اور ایک سخت لذت شکن نتیجہ کا، اس لئے اب کوئی صورت سوائے اس کے نہیں ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں"!

یہ انکشافات ایسے نہ تھے کہ میں یوں آسانی سے رات بسر کر لیتا، سوچتا رہا کہ افضال نے جو کچھ کہا وہ ناممکن تو نہیں ہو سکتا لیکن اس کے لئے ممکن ہونا ایک حد تک ضرور ناممکن معلوم ہوتا ہے، غالب کا یہ شعر بار بار مجھے یاد آیا اور سوچتا رہا کہ اگر افضال کا بیان درست ہے تو پھر اس کی نفسیاتی توجیہہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

میانۂ من و او شوق حائل افتاد است

کیونکہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے میں نہ اس نزاکت کا قائل ہوں کہ

"ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

اور نہ اس خلاف فطرت جذبات کا کہ

"میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"

یہ سب تاویلات بدنصیبی ہیں، ورنہ جن ہونٹوں کا انکار بھی جو صلہ افزا ہو، ان کے اقرار کا کیا کہنا، بہرحال صبح ہونے کے بعد نہ اس لیے کہ افضال کے واسطے کوئی تدبیر نکالوں بلکہ محض بر بنائے شوق تجسس یہی جی چاہا کہ کچھ وقت تنہائی شیریں کا ملجاتا تو اس باب میں اس کے خیالات بھی معلوم کرتا۔ میں اب جلد واپس جانا چاہتا تھا میں نے ایک دفعہ گھبرا کر سامنے میز سے کاغذ کا ایک پرزہ لیا تا کہ اس کو اطلاع دوں۔ اتنے میں افضال آ گیا، میں نے اس سے ذکر کیا تو وہ ہنسا اور بولا کہ "نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی، جو دنیا کل تھی، آج نہیں ہے" آپ سے گفتگو کرنے کے بعد حالات میں بہت انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ شیریں سے بہت جلد جدا ہو جاؤنگا، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں بہت سے کھیل ایسے بھی کھیل سکتا ہے جن کو کمیڈی یا ٹریجڈی بننے سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہیئے۔

میں نے اسے تعجب سے دیکھا اور پھر بالکل بے اختیارانہ طور پہ

دریافت کیا "کب تک" ـــــــ بولا "شاید آج ہی ابھی"۔

سارا دن گزر گیا۔ اور شیریں سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ کسی خاص معاملہ میں اپنے مشیر قانونی سے مشورہ کرنے گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد افضال سے یہ مختصر گفتگو ہوئی اور پھر اُس کا بھی پتہ نہ چلا۔ شام کو وہ واپس آئی تو بہت مسرور نظر آئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"افضال ہیں؟"

میں نے کہا: "وہ تو آپ کے بعد ہی فوراً چلے گئے اور پھر نہیں آئے"۔

وہ یہ سن کر کچھ سوچتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں داخل ہو گئی اور تھوڑی دیر کے مجھے اندر بلا کر کہا۔

"آپ نے کچھ اور بھی سُنا۔ دیکھئے آپ کے افضال صاحب میرے نام ایک خط چھوڑ گئے ہیں ملاحظہ کیجئے"۔

۱۹ نومبر۔ ۹ بجے صبح

"میری آپ کی زندگی کا افتراق جسے دنیا نے ہمیشہ اپنی غلطی سے

یا ہم لوگوں کی غلط تعبیر حیات سے اتحاد سمجھا، اُس وقت سے متوازی چل رہا ہے جب آپ نے تھک کر اور میں نے آپ کو تھکا ہوا جان کر، ایک راستہ کو بغیر جانے بوجھے منزل تک پہونچنے والا سمجھ کر اختیار کر لیا، پھر جس طرح دو ہمسفر مسافر اس اندیشہ سے کہ دوسرا تنہائی میں اُسکی دولت نہ لوٹ لے، ایک محتاط خاموشی کے ساتھ راستہ کاٹ دیتے ہیں، اسی طرح مین نے اور آپ نے یہ سفر اختیار کیا، اوّل اول تو اس نے بہت لطف دیا، کیونکہ یقین تھا کہ منزل پر پہونچنے کے بعد خاموشی وضبط کا یہ کھیل اس طرح ختم ہو جائیگا کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں گے اور گلے ملجائیں گے لیکن بعد کو، ہم نے محسوس کیا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ منزل کا نشان کچھ دھندلا ہوتا جاتا ہے اور راستہ کی اٹھکھیلیاں سنجیدگی میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اپنی جگہ کن جذبات کو لئے ہوئے تھیں، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا، آپ کے اوقات بھی چند دن بعد اس

فکر میں بسر ہونے لگے کہ نقاب کے نیچے کا اصلی چہرہ کیونکر دکھایا جائے اور جس "غلط" کو "صحیح" بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس کو کس طرح مٹایا جائے، پھر اس تمثیل کی دنیا میں آپنے کتنے دن بسر کئے ؟ اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ چند سال کا تھا، لیکن جب اُسے گزارنا پڑا تو معلوم ہوا کہ مکر و فریب کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ایک مستقل "گراں جانی" ہوتا ہے اور اور اس کا تحمل بسا اوقات بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

ہم لوگ جس تہذیب کے عادی ہو گئے ہیں اُسکی مثال ایک بازیگر کا صندوق ہے جس کے اندر سے وہ ہر مرتبہ ہاتھ ڈال کر ایک ہی چیز کو مختلف صورتوں میں پیش کرتا ہے درانحالیکہ حقیقت ان سب سے جدا ہے، چنانچہ اس وقت بھی جب کہ تمام قدیم رشتوں کو توڑنے کے لئے آمادہ ہوں اتنی جرأت نہیں کر سکتا کہ جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دوں، بلکہ وہی پیچیدگی، وہی "مجازی نمائید گی" کی زندگی کی قسم کا انداز بیان اب بھی قائم ہے۔ خیر!

بہرحال کوشش کروں گا کہ کم از کم اپنے چہرہ سے تو اب نقاب اُلٹ ہی دوں، اور ممکن ہو تو آپ کو بھی بے نقاب کر دوں، سنئے دنیا میں مرد و عورت کی یکجائی اس حال میں کہ وہ یک ذات نہیں ہیں اس قدر مہمل بے معنی چیز ہے کہ کوئی ذی عقل اس کی تاویل کر ہی نہیں سکتا، استغنا کی وہ حد نہایت ہی خطرناک ہوتی ہے جب دوسرا اپنے عدم استحقاق کو محسوس کرنے لگے اور میرے خیال میں محسن کُشی کے جذبات اسی جگہ پہونچ کر پیدا ہونے لگتے ہیں، اس لئے آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر آج میں اپنے آپ کو آپ سے منحرف پاتا ہوں تو اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مجھ میں اب آپ کے الطاف و کرم کے برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے اور میں ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اپنی عنایتوں سے اس حال میں کہ میں ان کا مستحق نہیں ہوں مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہیں

بہرحال آج میں اپنے دل کی بغاوت کا آپ پر

اعلان کرتا ہوں اور مجبور ہوں کہ کوئی راہ اپنی زندگی کی ایسی نکالوں جو جسمانی حیثیت سے خواہ کیسی ہی مجروح کیوں نہ ہو لیکن روحانی حیثیت سے بے نیاز و پُر سکون ہو۔

اب جو کبھی سوچتا ہوں کہ اتنے دن میں نے کیوں اور کس امید پر آپ کے ساتھ بسر کئے تو "ساحل و موج" کا تعلق میرے پیش نظر ہو جاتا ہے اور اپنی "تشنہ لبی" پر افسوس کرتا ہوں، ممکن ہے آپ کو اپنی "تموج آبی" پر اب بھی فخر و ناز ہو۔ بہر حال جس طرح ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، اسی طرح میرے صبر و ضبط کی بھی ایک عمر تھی جو آج ختم ہو گئی اور میں اس کی موت کا اعلان آپ پر بھی کر رہا ہوں

میں چند دن سے اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں کہ جب دنیا میں رہنا ہے تو اس کے مقرر کردہ اصول پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس لئے وہ ایک تلخ گھونٹ کی طرح ازدواج کے غیر شاعرانہ طریقہ کو بھی برداشت کرنا چاہیئے۔ لیکن چونکہ آپ کی طرح میں نے بھی اس کو کبھی

پسند نہیں کیا تھا، اس لئے کہنے کی جرأت نہ ہوئی اب
بھی اس کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ آپ مان ہی لیں،
بلکہ صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ آپ اُس کے بعد
مجھ سے نفرت ہی کرنے لگیں اور اس طرح مجھے بھی ہمیشہ
کے لئے مایوس ہو جانے کا بہانہ ہاتھ آجائے

چونکہ میں اب اس معاملہ میں زیادہ رومان پیدا کرنا
مناسب نہیں سمجھتا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں
ایک خودکشی کرنے والے کی طرح ایسی اطلاع دوں جسکا
کوئی علاج ممکن نہ ہو، میں ابھی یہیں رہوں گا اور سول
ملٹری ہوٹل میں قیام کروں گا۔"

میں سمجھتا تھا کہ اس خط کا شیریں پر بڑا اثر ہوگا، اور ممکن ہے
کہ ایک عورت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں، لیکن یہ
دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بہت مسرور و مطمئن تھی اور
جس وقت میں خط پڑھ چکا تو ایک ایسے قہقہہ کے ساتھ جو میں نے کبھی
نہیں سُنا تھا، اُس نے وہ خط مجھ سے واپس لیا اور کہا کہ :۔

"مہربانی کر کے آپ افضال کے کمرے میں جائیے اور دیکھئے
اُن کے نام کا کوئی خط تو وہاں نہیں ہے، اگر ہو تو لیتے آئیے"۔
میں گیا تو ایک لفافہ اس کے نام کا میز پر موجود تھا، میں اُس کو
لے آیا، اُس نے دیکھ کر کہا کہ "آپ کو زحمت تو ہو گی، لیکن مجھے امید
ہے کہ آپ اس کو برداشت کریں گے اور یہ تحریر اُن تک اسی وقت
پہونچا دیں گے"۔
مجھے پہلے کچھ حیرت ہوئی کہ یہ کیا قصہ ہے لیکن اسکے سمجھنے
سے زیادہ ضروری یہ معلوم ہوا کہ کسی طرح افضال سے جا کر ملوں۔
——— جس وقت میں پہونچا تو وہ برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی مسکرایا اور بولا کہ "میں سمجھتا تھا کہ آپ آئیں گے"۔
میں نے کہا ——— "مگر یہ تو نہ معلوم تھا کہ آئیں گے اور
کچھ ساتھ لائیں گے"۔ میں نے وہ خط اُسے دیا اور جب اُس نے
کھولا تو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ شیریں نے یہ خط اُس کے
خط لکھنے سے دو گھنٹہ قبل لکھا تھا۔
خط بہت مختصر تھا لیکن قوادونیال کی عجیب مثال۔ اسکا مضمون یہ تھا

۱۹ نومبر - ۶ بجے صبح

"میری آپ کی خاموش جنگ آج ختم ہوتی ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہوں اور میرا یہ خط لکھنا گویا آپ کے سامنے سپر ڈال دینا ہے۔

بہرحال اب چارۂ کار سوائے اس کے کوئی نہیں کہ ہم خیالی دنیا کی زندگی ختم کر کے سوسائٹی کے اصول پر کاربند ہوں اور وہی کر دال جو اس سے قبل کرنا چاہیئے تھا۔

آج میں اپنے مشیر قانونی سے گفتگو کر کے، کل ہمیشہ کے لئے عمل کے لحاظ سے بھی وہی ہو جاؤں گی جو اب تک خیال کے لحاظ سے تھی۔"

یعنی آپ کی ہمیشہ

شیریں

شام کے وقت وہ منظر کس قدر دلکش تھا کہ افضال و شیریں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، اور افضال اس امر پر متاسف تھا کہ کیوں نہ اس کو شیریں کا خط پہلے مل گیا، اور

شیریں اس بات پر نادم کہ کیوں اس نے خط لکھنے میں دو گھنٹے کی عجلت کی۔

یہ بھی قدرت کی ستم ظریفیاں ہیں کہ پہلے تو پورے چھ سال ان دونوں نے اس کوشش میں بسر کر دئے کہ ایک دوسرے پر غالب آکر نتیجہ تک پہونچیں اور پھر جب فیصلہ کا وقت آیا تو صورت یہ پیدا کر دی کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ شکست کا معترف تھا۔ میں نے یہ منظر دیکھا اور دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ :۔

"وہ صلح جو فریقین کی شکست پر قائم ہوتی ہے۔ زیادہ مستحکم ہوا کرتی ہے"

انھوں نے سُنا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکرانے لگے۔

چاند کا سفر

رات زیادہ گزر گئی ہے، ساری دنیا محو خواب ہے اور میں اوپر کی منزل میں تنہا بیدار۔ خلوت کی بیداری بھی کسقدر عجیب ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پردہ آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا ہے اور اُسکے نقوش یکے بعد دیگرے نگاہ کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں، ماضی کی داستان بھی کس قدر پُرلطف داستان ہے، اور کتنی حسرتیں ہماری اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں، حال تو گویا ماضی کا نقطہ ہے کہ خود اس کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن تمام خطوط و دوائر اسی کی جنبش کا نتیجہ ہیں، مستقبل نام ہے صرف توقعات کا، مفروضات کا، تمناؤں کا، لیکن توہمات پر انسان جی تو سکتا ہے، مسرور نہیں ہو سکتا، اس لئے ایک ذرا پختہ عمر کے انسان کے لئے بہترین مشغلہ تنہائی کا یہی ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات پر غور کرے، گزری ہوئی باتوں کو یاد کرے، اور اگر ایام شباب گزر چکے ہیں تو رات کا بڑا حصہ اس کے ماتم میں

صرف کر دے۔ کم ہیں وہ لوگ جن کا شباب ان کی تمناؤں کے اندازہ سے خوش کام بسر ہوتا ہے اس لئے عہد ماضی کے افسانہ کا یہ ٹکڑا جبقدر بھی حیرت انگیز ہو کم ہے۔ لوگ وقت گزر جانے پر بھی اُمیدوں کی فرضی دنیا قائم کرتے رہتے ہیں اور پھر خود ہی مایوس ہو کر اُس کو مسمار کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں انسانی بے بال پری کے آخری حدود۔ دادیر تک دماغ میں مختلف خیالات آتے رہے اور پھر کچھ دیر تک فلکیات کے بعض مسائل پر غور کرتا رہا اور چاند کی خنک آب و تاب میں آنکھ بند کر کے لیٹ رہا۔

جیسے کسی نے یہ کہہ کر جگا دیا کہ ہوائی جہاز تیار ہے۔ ہاں یاد آیا مجھے بھی تو سفر کرنا تھا، داڑھی مونڈی، کنگھا کیا، کپڑے بدلے، گرم کپڑوں کا صندوق، موٹے موٹے کمبلوں کا بستر اور ایک بکس مختلف ضروری چیزوں کا خادم کے ذریعہ سے موٹر تک پہنچایا اور چل دیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خیال آیا کہ ٹکٹ تو نہیں بھول آیا، جیب میں ہاتھ ڈالا تو

موجود تھا۔ یہ ٹکٹ ایک سال کا موسمی ٹکٹ تھا اور عمومی تھا، عمومی سے مراد یہ ہے کہ میں کرۂ ارض کے ہر مقام سے سفر کر سکتا تھا، اور کرۂ قمر کے ہر مقام تک جا سکتا تھا۔ کاسموپولیٹین کمپنی چونکہ سب سے زیادہ بھروسہ کی کمپنی تھی اور اُس کے جہاز بھی نہایت تیز رو اور آرام دہ ہیں اس لئے کرایہ تو ضرور زیادہ ادا کرنا پڑا لیکن میں نے اسی کو ترجیح دی اور آخر کار سب کو خیر باد کہہ کر اس کرہ کی سیاحت کے لئے چل دیا جس کے تابناک وجود کا ہمارے کرۂ ارض کی بہت سی عشق خیز راتوں پر بڑا احسان ہے۔

دس منٹ میں پولو گراونڈ کے میدان میں پہونچ گیا، اور کپتان کو ٹکٹ دکھا کر غیر ضروری سامان، چھت کے ایک کمرہ پر رکھوا کر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا، صبح کا وقت تھا، ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی، بادلوں کے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے تھے لیکن بالکل دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہلکے اور تنک۔ بگل کی کرخت آواز بلند ہوئی، جھنڈا کھول دیا گیا اور سامنے کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ ہلکی سی جنبش ہوئی اور تین پہیوں کے اوپر جہاز تھوڑی دور چل کر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔

میرے علاوہ نو آدمی اور بھی تھے جن میں سے تین عورتیں، دو نوجوان لڑکیاں اور چار مرد تھے یہ سب امریکہ کے باشندے تھے اور براہ راست وہیں سے سوار ہوئے تھے، یہ جہاز دو درجوں میں منقسم تھا، اوپر کا درجہ اسباب کے لئے تھا اور دوسرا بیٹھنے، سونے اور کھانے کے لئے، لیکن ہر کام کے لئے مختلف حصے تھے۔ کپتان کے کمرہ میں ایک طرف لاسلکی ٹیلیفون اور ریڈیو لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک بڑی گھڑی نہایت ہی پیچیدہ مشینری کی نصب تھی جس کے ذریعہ سے درجۂ حرارت، موسمی کیفیت، طول البلد، عرض البلد، درجاتِ فلکی اور خدا جانے کیا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔

میری جگہ بالکل دریچہ کے پاس تھی، اس لئے بلند ہوتے وقت اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ تمام مکانات اور درخت وغیرہ کس طرح چھوٹے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد شہر کا بلند مینار صرف ایک چھوٹا سا دھبّہ نظر آنے لگا، سردی بھی بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بادل کے ٹکڑوں کے اندر سے ہم کو گزرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ بادل بالکل خشک تھے اور دریچوں کے شیشوں پر ایک

ہلکے نم کے علاوہ اور کوئی اثر نہ پیدا کرتے تھے ۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ جہاز کے تمام مسافر پورے ہوگئے ہیں اور اب براہ راست بغیر راہ میں کہیں قیام کئے ہوئے سیدھے کرۂ قمر تک جاتا ہے، تو میرے اعصاب میں اک خاص قسم کی بےچینی محسوس ہونے لگی، اور سوچنے لگا کہ دیکھئے وہاں کیا گزرتی ہے اور کس طرح واپسی ہوتی ہے ۔

جہاز کی رفتار نہایت تیز ہوتی جاتی تھی اور سامنے جو رفتار پیما لگا ہوا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس وقت ہم ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے تھے لیکن معلوم ہوا کہ ابھی اس کی رفتار اور بڑھے گی۔ میں بیٹھا ہوا اپنی اس نئی سیاحت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ خادم آیا اور میرے سامنے کے مسافر کے پاس ایک پیام لایا جو اسیوقت لاسلکی کے ذریعہ سے موصول ہوا تھا۔ یہ اسے دیکھ کر فوراً اٹھا اور ٹیلیفون کو امریکہ کے کسی کارخانہ سے ملا کر کاروبار تجارت کے متعلق کچھ ہدایات دینے لگا ۔

میں سخت حیران تھا کہ اسوقت جب کہ جہاز کم از کم ۲۰۰ میل کی

بلندی پر فضا میں اُڑ رہا ہے کیوں کہ امریکہ کے کسی آدمی سے براہ راست گفتگو کرنا ممکن ہے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو میرے سامنے ہو رہا تھا اور کوئی وجہ اس سے انکار کی نہ تھی۔

دن بھر کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی، کیونکہ اب کُرۂ ارض کا کوئی حصہ ہم کو نظر نہ آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا جہاز صرف آسمان کے نیل میں تیرتا ہوا جا رہا ہے۔ ہوا چونکہ ۱۰۰ میل کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی اس لئے ہر شخص کے منہ سے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور نبض کی رفتار ۱۵۰ فی منٹ تک پہونچ گئی تھی۔

شام کو چاند کے طلوع کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور وہ آج ہم سے زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ ہم لوگ کھانا کھا کر سینما دیکھ رہے تھے کسی رسدگاہ سے ایک لاسلکی پیغام کپتان کو موصول ہوا، کپتان ہم لوگوں کے کمرہ میں آیا اور کہنے لگا کہ ”چاند کے بڑے سمندر میں شدید سیلاب ہونے کی وجہ سے جلد وہاں پہنچنا خطرہ سے خالی نہیں ہے اس لئے یہ سفر کم از کم دس دن اور بڑھ جائیگا، کیونکہ جہاز کی رفتار کم کرنا ہو گی۔“

"بعض کو اس خبر سے خوشی ہوئی، بعض کو رنج، لیکن میں نے اس کو مذاق سمجھ کر کوئی اثر نہیں لیا اور سامنے پردہ پر نہایت لطف کے ساتھ میری پکفورڈ کی ایکٹنگ کو دیکھتا رہا۔

میں زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ حقیقتاً اب جہاز میں کوئی نیا تجربہ نہ ہوتا تھا: وہی کھانا، پینا، سینما دیکھنا اور سو جانا روز کا مشغلہ تھا، اب میرے مراسم لوگوں سے کافی طور پر بڑھ گئے تھے، اور اس لئے کبھی کبھی برج کھیلنے میں بھی مشغول ہو جاتا تھا۔

ایک دن البتہ جہاز کا انجن کچھ خراب سا ہو گیا تھا اور جہاز نیچے کی طرف مائل ہونے لگا تھا، لیکن کپتان نے دوسرا انجن کھول دیا اور پانچ میل سے زیادہ نہ اُترے تھے کہ جہاز پھر تازہ قوت کے ساتھ صعود کرنے لگا۔

بیس دن کے بعد ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار بہت بڑھ گئی لیکن رفتار پیما صفر پر ہے، تھوڑی دیر میں کپتان مسکراتا ہوا آیا اور بولا کہ "ہمارا سفر تو حقیقتاً آج ختم ہو گیا، اور اب ہمارا کوئی

کام باقی نہیں رہا"۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم کششِ زمین کی حدود سے نکل کر کششِ قمر کی حدود میں آ گئے ہیں تو میں اُس کا مدّعا سمجھا۔ الغرض ہم چاند کی طرف خود اپنی قوت سے نہیں جا رہے تھے بلکہ چاند خود ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا، اور جہاز زمین کی طرف اُترنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ چاند کی کشش دفعتہً اُسے نہ کھینچ لے اور اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا تھا کہ ہم چاند میں پہونچ کر دفعتہً کسی چیز سے ٹکرا جائیں گے۔

اُس وقت سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربہ میرے لئے یہ تھا کہ میرا بدن بالکل ہلکا ہو کر پھول سا ہو گیا تھا، اور جس وقت میں قدم اٹھاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُڑ رہا ہوں۔

۲

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدودِ زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا، چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند، کرۂ زمین کے گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ تھے، یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے

تھے جو حبِّ وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً حج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔
جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے، آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول۔
جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی، کیونکہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارہ کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اُتنی ہی بلند نظر آرہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیوں کر ممکن ہے اور فوراً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آگیا جو کہا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اُس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہہ جاتا۔
واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین، جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت، ہم کو اوپر نظر آرہی تھی، اور اُس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی

ہم تک نہ پہنچتا تھا۔ عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اسکی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے ——— میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخر کار ایک خاتون مچل ہی گئیں کہ "مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہنچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو، کیونکہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں ——— زمین کے سمندر بہہ بہہ کر نیچے کی طرف آسکتے ہیں ——— تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے"۔

سب لوگ ہنسے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ "جلد سے جلد پہونچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے" تو اس نے جواب دیا کہ "آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہونچ سکتی ہیں لیکن اس کا صحیح حال صرف اسیوقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"۔

خاتون: "یہ کیونکر؟"

کپتان: "وہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی، جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلا نیچے کی طرف

پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہونچ جائے، اسوقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلے ہی کی طرح چاند کی طرف کھنچا جارہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رُخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے، اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلہ کی طرح نہیں بلکہ ایک طائر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے پہونچ جاویں گی لیکن اگر اسی طرح جیسے چینی کے گلدان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ پٹک دیا جائے"۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتہً جہاز کی رفتار ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی، اور وہ ایک جگہ معلق ہو کر قائم ہو گیا، اس جھٹکے کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے لیکن بعد کو کپتان نے اس کی اصل وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ جہاز کا انجن کشش کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور میں نے اندازہ اسی کشش کا کیا تھا جو

زمین کے لئے مستعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے اب میں نے گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے، اور یہ صورت شائد اب نہ پیدا ہو۔"

کپتان نے اس حالت پر اظہار افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ "اگر جھٹکے سے کسی کو ایذا پہنچی ہو تو معاف کیا جائے۔" اب ہمارا جہاز زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا ——— سمت کی تعیین چونکہ فضائے بسیط میں نہیں ہو سکتی، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چونکہ پہلے روزانہ اور اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی، اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آتی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے

بھی معلوم ہوا کہ چاند میں روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں۔ پھر چونکہ شعاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جاکر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہوسکتی بہرحال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہوگیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا یعنی جو وزن ایک روٹی کا ہوتا تھا اُس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چونکہ اس کا تجربہ پہلے ہوچکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا۔ یہی حال مشروبات کا تھا' اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علیحدہ کردی گئی تھیں۔ پھیپھڑا ساکن تھا اور

قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہو گئے تھے۔ کیونکہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز اور ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کر کے خون میں مل جاتی ہے اور رفتارِ خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

سردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں، ہر شخص نے اپنے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ کہ جذباتِ محبت و ہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جارہی تھی حتیٰ کہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ اُس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوتی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا، بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔

عورتوں کا احترام، یوروپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے۔ مرد عورت کے لئے نہ اپنی جگہ خالی کرتا ہے اور اگر جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو نہ اُٹھ کر اس کو سنبھالتا ہے بلکہ بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔ گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہو گیا ہے کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہنچتا ہے۔ ادائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اسکا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سُن کر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں۔

کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا ہے نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رُخ ہمارے

سامنے نہ تھا، یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن و منور عجیب و غریب چیز معلوم ہوتی تھی۔

سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ پسینے پسینے ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف غبارے جو یکسر شعلہ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ انکا شمار مشکل ہے۔ کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ "ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہونچگیا ہے جو ابھی تک گیسی حالت میں مشتعل ہیں"۔

اس کے چہرے سے تشویش کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اُس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ

چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولے کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور پھر مشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتہً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بچھا دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب METEOR تھے۔

نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا، اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہو گی، جہاز کے عرشہ پر آ کر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے۔

ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا، لیکن اس میں سپید سپید نقطے بہ کثرت پائے جاتے تھے، اُن کے بہت سے ٹکڑے بطور یادگار مسافروں کو تقسیم کر دئے گئے اور کچھ محفوظ کر دئے گئے تاکہ کرہ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیدئے جائیں۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پُرلطف وقت وہ تھا جب پورے ۱۶۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی ——— یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوتِ بصارت آج از سرِ نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر، جنوری میں۔

سب لوگ کمبل اُتار اُتار کر عرشہ پر آ گئے اور بے اختیار ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جس کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ ہو گئے تھے، یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور انکا خیال تھا کہ جب سیاحتِ قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان

شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائے گا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد راتوں کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لے کر باہر پھینک دیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن اُن کی اور میری حیرت کی حد نہ رہی، جب اس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اُڑتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اُس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پُر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری تھیں، باہر پھینک دیں اور اس تماشہ کا لطف اُٹھایا جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اُڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کر کے ٹوپی کو پھر اندر کھینچ لیا۔ مس جوزف نے

اُس کو پھر فوراً باہر پھینک دیا اور کپتان نے پھر اُسی طرح اُسکو لے لیا۔
دیر تک یہ مشغلہ جاری رہا اور غالبًا جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہو کر رات کا سماں نہ پیدا کرتا، دن نہایت مختصر صرف چار گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کر دیا، بجلی کی روشنی ہو گئی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کمبل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص تیار ہو گیا۔

اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ہم سب سو کر اُٹھے تھے کہ دفعتًہ روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آرہے ہیں جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر زمین کے آغوش میں پہونچنے والے ہیں، کیونکہ اونچے اونچے پہاڑ، بڑے بڑے دریا، وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں

توہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہم کو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جا رہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی و پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔ الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اُترا جسے وہاں کی زبان میں سوشان یعنی تختۂ گل کہتے ہیں۔

یہاں تک تو سطح قمر تک پہونچنے کا حال تھا۔ اب میں کچھ واقعات و تجربات وہاں کے بیان کرتا ہوں۔

کرۂ ارض میں سُنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لئے اگر کوئی کرۂ زمین سے چھوٹا ہو تو کمی کشش کی وجہ سے ہر چیز کا وزن کم ہو جائے گا یعنی اگر کوئی چیز کرۂ ارض میں ایک من کی ہے تو چاند میں پہونچنے کے بعد وہ صرف چند سیر رہ جائے گی۔

جہاز پر بھی اس کا کچھ علم ہو گیا تھا لیکن پوری حقیقت یہاں پہونچنے پر معلوم ہوئی، جس وقت ہمارا جہاز سوشان کے میدان میں اُترا تو وہ اتنا ہلکا ہو گیا تھا کہ سلنڈروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اُترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے بلندی سے کوئی پتنگ

ٹوٹ کر جھپ کھاتی ہوئی نیچے اُترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اُترے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی اور کچھ اُسی قسم کے آثار حیات دکھائی دیں گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بجائے انسانی آبادی کے وہاں ہم نے ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل و صورت میں تو انسان سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضاء میں بہت فرق تھا، مثلاً یہ کہ بجائے دو ٹانگوں کے اُن کے صرف ایک ٹانگ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ کشش کم ہونے کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لئے ایک ہی ٹانگ کافی ہے۔ جب یہ مخلوق چلتی ہے تو اپنی ٹانگ کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے پھر جس طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگ پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لئے یہ مخلوق بالکل چھلاوے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کی ٹانگ گاؤدم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لکڑی کی طرح برابر ہوتی ہے جس میں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علیحدہ بھی کر سکتے ہیں ـــــــ

یہ ٹانگ کمر سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک باریک سی ہڈی کا۔ چونکہ یہاں کی زندگی کے لئے ہوا کی ضرورت نہیں ہے اس لئے پھیپھڑا بھی نہیں ہوتا اور غذا کے لئے معدہ بھی نہایت مختصر سا ہے، کیونکہ صرف رقیق چیزوں پر گزر ہے جن کا فضلہ پسینہ کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لئے امعاء وغیرہ بھی نہیں ہے ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی ندارد ہے اور سخت چیزوں کی غذا نہ ہونے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سوراخ پیشانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جس میں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں دو رخساروں پر اور دو پشت پر، ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت کمزور جنس کا فرق بھی ان میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سلسلۂ تناسل ان کے ہاں کس طرح

قائم ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کا راز ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔
ان کی تمام گفتگو سیٹیوں یا اشارات سے ہوتی ہے اور اُن کے جسم کے
سنہرے بال جو جا بجا کثرت سے پائے جاتے ہیں، گفتگو کے وقت
کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والے پر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے

جس وقت ہمارا جہاز پہنچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کے
اشرف المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں، چاروں طرف آ گئے اور
لگے اپنے گول گول دیدے پھرا کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی
دیر میں یہ لوگ لپٹ جائیں گے اور نوچ کر کھا جائیں گے۔ کپتان نے
جو یہاں کے حالات سے زیادہ واقف تھا، اس نے کچھ اشارات کی
مدد سے، کچھ سیٹیاں بجا بجا کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی اُٹھ کر اور طرح طرح کا
منھ بنا کر خدا جانے اُن سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے، لیکن ہم نے صرف
اس قدر محسوس کیا کہ وہ دور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے یہی کہا ہوگا
کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہو جاؤ، ہماری ہمسفر خاتونوں کی حالت
نہایت خراب تھی، اُنھوں نے چہرے چھپا لئے تھے اور مردوں سے
لپٹی جاتی تھیں، میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور دروازے بند کر کے

سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے اور اب بظاہر واپسی کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بالکل کرۂ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سبزہ و درخت کا پتہ نہیں، جا بجا اونچی اونچی چٹانیں ضرور ہیں جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر پتھروں پر، چٹانوں کی چوٹیوں پر، نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات BRYSTALS مختلف ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں جو دور سے ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اُترا تھا، تختۂ گل کے نام سے موسوم تھا۔ حشرات کا یہاں پتہ نہیں ہے اور نہ چوپائے کہیں نظر آتے ہیں، طیور میں صرف ایک چیز بکثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم ہندوستان کے چمگادڑ سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کے پر و بازو بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ چیز معنوی حیثیت سے تو یہاں کی اجنبیت تھی

اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑھتی ہوئی سردی، آفتاب چمک رہا تھا لیکن بجائے گرمی کے اور خنکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پاؤں کی ٹھٹھرن کسی طرح نہ جاتی تھی اور ایک ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے نہ کوئی شہر، یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی اختلاط ہے اور نہ ایسی منافرت ــــــ ایک ایک غار میں چار چار پانچ پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب و روز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لئے باہر نکل کر چشموں پر جا کر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہیں جا کر پڑ رہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے زیادہ دلکش مقام ایک تو وہ وسیع حصہ سمندر ہے جو بالکل خشک ہوگیا ہے اور جس میں اتنے بڑے بڑے غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک اُن کی تھاہ نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ ان کے اندر کیا ہے؟ دوسری تفریح کی جگہ سمندر کا وہ لبریز حصہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی

مخلوق سوار ہو کر اُن سے جہازوں کا سا کام لیتی ہے۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی مچھلی بالکل چاندی کی سی پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی چربی نکال کر جسم پر ملتے ہیں اور اس کی کھال کو اوڑھتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا، اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی چھینکے کی طرح تیار تھی جس میں چار چار وہی چمگادڑ جتے ہوئے تھے اور ایک چلانیوالا سی عجیب الخلقت قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھ کر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کیا، لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں، سیٹیوں، آنکھ کی گردشوں اور ڈراؤنی شکلوں سے ایسا ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس کے چھینکے کے اندر گر پڑا اور چمگادڑ اُس کو لیکر اوپر اُڑ گئے۔ میں چیخ رہا تھا، چلّا رہا تھا لیکن اس جانور پر کوئی

اشمہ نہ تھا، اور میں لٹکا ہوا اوپر فضا میں چلا جا رہا تھا۔ اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی طرح آگے پیچھے چھینکوں میں لٹکے ہوئے چلے آرہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹہ کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا کر ٹھہر گئی۔ میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آگئے، یہاں پہلے سے ایک جماعت ______ سروں پر مچھلی کے کھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے نوکدار ٹکڑے لئے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرمانروا کے پاس جا رہے تھے اور یہ سب اسکے سپاہی تھے جو ہمارے استقبال کیلئے پہلے سے موجود تھے

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ کنلوں، سمور کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ لپیٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اب شام ہوگئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور وادیوں کی شفاف چشموں پر پڑ کر بیشمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں، یہ منظر یقیناً اس قدر دلکش تھا کہ

تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد دفعتاً ہم کو ٹھہر جانا پڑا، کیونکہ یہاں سے اب شاہی محلات کے حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قائم کر رکھا تھا، لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع غاروں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاروں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیچیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بُھلیاں ہو گیا ہے اور اگر کوئی واقف الحال نہ ہو تو پھر ایک مرتبہ جانے کے بعد باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانہ پر پہونچکر ہم لوگ ٹھہر گئے اور اندر سے کئی آدمی فاسفورس کی مشعلیں لئے ہوئے نمودار ہوئے جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہر ہی رہ گئے اب ہم ایک سُرنگ کے اندر جا رہے تھے جس کی چھت سے سرد پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سُرنگ ایک فرلانگ کی تھی، اس سے

نکل کر پھر ہم روشنی میں آئے لیکن اب چٹانوں کا نا متناہی سلسلہ سامنے
تھا۔ اس کے بعد پھر دوسری سرنگ ملی۔ الغرض اسی طرح یکے بعد
دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ
کے اندر ہم خاص قصر شاہی تک پہونچے جہاں بہت سی مشعلیں روشن
تھیں۔ یہ قصر شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کو کھود کر
بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا جس کے جسم پر
بہت سی سیپیاں چپکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اسی مچھلی کی
کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے، اس کی صورت
بھی ویسی ہی بھیانک تھی، یہ اُس وقت اپنی ٹانگ الگ کئے
ہوئے ایک مضغۂ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب
پہونچکر کھڑے ہو گئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم
ادا کیا، تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کے قسم سے
ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا اس کے پینے سے ہم لوگوں کی
ساری تھکن دور ہو گئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔
معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمۂ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب و غریب

اثرات پنہاں تھے۔

اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک وضع وصورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر رہ کر صبح کرنی پڑی۔ جب دوسرے دن آفتاب ذرا بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گزر کر چھینکوں میں بیٹھے، اس مرتبہ یہ چھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں۔ جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہونچے تو یہ چھینکے دفعتہً بہت بلند ہو گئے اور ڈرائیور نے آہستہ سے میرے بازوؤں میں چمڑے کے دو پر جو لپٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف مجھے اتنا ہوش ہے کہ گرنے کے بعد ہی فوراً وہ دفعتہً کھلنے شروع ہوئے، اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کر سکا اور سر

چکراتے چکراتے دفعتہً میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی چٹان سے جاکر ٹکرا گیا ہوں ـــــــــــ آفتاب بلند ہو چکا تھا اور میری چھوٹی بچّی مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھی، اور سامنے کرسی پر بیوی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں وہ پوچھ رہی تھیں کہ "آج سوتے میں تم نے چیخ کیوں ماری"۔ میں اُن کو دیکھ کر سمجھ رہا تھا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں لیکن جب اُنکی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ :-

"چاء پی لوں تو بتاؤں کہ کتنی بڑی مہم سر کر کے آیا ہوں"

"لکھنؤ و لکھنویات"

سوچ سمجھ کر کام کرنے کا مفہوم ہم لوگوں میں عام طور پر یہی ہے کہ کبھی کوئی کام نہ کیا جائے۔ برخلاف اس کے مجھ پر یہ الزام قائم کیا جاتا ہے کہ پہلے کام شروع کر دیتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ :-

نہ ہو تو کیجئے کیا اور ہو تو کیوں کر ہو!

اس زندگی میں سب سے پہلی آزادی تو مجھے اُسوقت ملی۔ جب میری بیوی نے انتقال کیا، صبح کو وہ رخصت ہوئیں، شام کو تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سیدھا کلکتہ چلا گیا، اس لئے نہیں کہ انکی جدائی کا غم دور ہو جائے بلکہ صرف اس لئے کہ جب آدمی کی بیوی نہ ہو تو سوائے آوارہ پھرنے کے وہ آخر کر ہی کیا سکتا ہے۔ دوسری آزادی مجھے ایک سال کے بعد ملی۔ جب میری دوسری شادی ہوئی اور چند دن کے بعد وہ ایک مہینے کے لئے اپنے گھر چلی گئیں۔ اس مرتبہ میں نے شمال کا رُخ کیا اور سب سے پہلی روانہ ہونے والی

گاڑی پر سوار ہوگیا، کامل اُنیس گھنٹہ کے بعد صبح کو جو دفعتہً آنکھ کھلی تو کانپور کا اسٹیشن نظر آیا۔ میں یہاں اُتر پڑا، منزل مقصود سمجھ کر نہیں، بلکہ محض اُس خیال سے جسے "دفع دخل" کہتے ہیں۔ دن بھر کانپور کی خاک چھاننے کے بعد جب شام کو اسٹیشن پہنچا تو لکھنؤ جانیوالی ریل تیار تھی اور مسافروں کے ہجوم سے تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ آج محرم کی آٹھ ہے اور یہ سب لوگ وہاں روشنی دیکھنے جارہے ہیں۔ میں شمسی تاریخوں سے بھی بے خبر رہتا ہوں۔ چہ جائیکہ قمری۔ اس وقت یہاں "محرم اور لکھنؤ" یہ دو نام سُن کر بے اختیارانہ طور پر ایک درجہ میں داخل ہوگیا، اور شام کو ۷ بجے اس سرزمین پر پہنچ گیا جو اپنی روایات کے لحاظ سے بجا طور پر "کربلائے ہند" کہلائی جاسکتی ہے۔

"یا حُسین! وا حُسینا!"

قبل اس کے کہ میں قیام لکھنؤ کے حالات قلمبند کروں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ میرے لئے یہاں کی زیارت کا یہ اولین شرف تھا اور میں نے جو خیالی تصویر یہاں کی اپنے دماغ میں کھینچ رکھی تھی۔ اس کا تعلق یکسر "حُسن و غنا" سے تھا۔ یعنی میں سمجھتا تھا کہ

لکھنؤ کا ذرہ ذرہ معمورۂ جمال و موسیقی ہے، اور رات کی تاریکی میں یہاں بھی وہی نیرنگ حُسن و عشق نظر آتا ہے جو کسی وقت عہدِ عباسیہ میں بغداد کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں کی نزاکت پسندیوں کے واقعات یہاں کی پچھلی تہذیب و معاشرت کی حکایات، میں نہیں کہہ سکتا کہ کب سے اور کیوں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ اس قدر کہن سال ہیں کہ اگر ان کی ابتدا "فسانۂ آزاد" کے زمانۂ تصنیف سے قرار دوں جب میں بہت کمسن تھا تو بیجا نہ ہوگا، ممکن ہے آج کوئی نقاد سرشار کے متعلق یہ حکم لگائے کہ اس نے اپنی تصانیف سے جو توہین لکھنؤ کی بلند معاشرت والوں کی ہے وہ غداری کی حد تک پہونچتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ عنفوانِ شباب کی دیکھی ہوئی "حُسن آرا" سے حریم ناز میں نہ سہی تو تختۂ بازار ہی پر ملنے کی خواہش اب بھی ضرور دل میں پیدا ہوتی ہے۔

مجھے بالطبع موسیقی سے لگاؤ ہے اور جان عالم نے ٹھمریوں کی ایجاد سے محمد شاہ رنگیلے کے خیال کو جس قدر رنگین بنا دیا۔ اس کا بھی معترف ہوں۔ ہر چند اصول فن کے لحاظ سے لکھنؤ کو کسی نایک کے

پیدا کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ لیکن جو بانکپن یا (لکھنؤ کی زبان میں چوچلا) صرف آواز کے اُتار چڑھاؤ اور "مینڈ مسک" سے انھوں نے پیدا کیا وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ لکھنؤ کا گانا لکھنؤ سے باہر میں نے بارہا سُنا، لیکن یہ تمنا ہمیشہ قائم رہی کہ وہیں کی فضا کی اگر کوئی خنک سی چاندنی رات اس کے لئے میسّر آجائے تو کیا کہنا، اس لئے جس وقت میں لکھنؤ اسٹیشن پر پہونچا تو میرا خیالی لکھنؤ میرے دل و دماغ میں خوشبو کی طرح بسا ہوا تھا اور ہر چند یہ معلوم کرکے کہ یہاں آج کل محرم ہے تھوڑی سی کلفت ہوئی مگر پھر اس خیال سے کہ یہاں کا یہ زمانہ بھی خاص چیز ہے میں نے اپنے اوپر سیاحت کی تمام مسرتیں طاری کرکے قیام کا ارادہ کر ہی لیا۔

میں جس حصّۂ ملک کا رہنے والا ہوں وہاں محرم کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا نہ وہاں مجالس عزا کا قیام ہوتا ہے، نہ بزم ماتم آراستہ کی جاتی ہے، بلکہ کہیں کہیں گھروں میں "ذکر الشہادتین" کے قسم کی کتابیں پڑھ کر یہ رسم ادا کر لی جاتی ہے۔ اس لئے میرے لئے لکھنؤ کی شام کا یہ منظر کہ ہر شخص نہایت شوق و مسرت کے عالم میں

پوری سج دھج کے ساتھ "شاہ نجف" چلا جا رہا ہے اور وہاں ہزاروں رنگین برقی قمقموں کی روشنی میں اس طرح پُر تکلف دعوتیں ہو رہی ہیں جیسے واجد علی شاہ کی سالگرہ منائی جا رہی ہو، بالکل نا قابل فہم معمہ تھا شاہ نجف سے لیکر حسین آباد تک تماشائیوں کا ہجوم اور امامباڑہ کا دلھن کی طرح سجا ہونا، لبریز حوض میں فواروں کا جاری ہونا، اور اُن کا روشنی کے انعکاس سے قوس قزح کی کیفیت پیدا کرنا ایک ایسا منظر تھا جس کو دیکھ کر ایک شخص بیساختہ کہہ سکتا ہے کہ :-

ایں خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستے

لکھنؤ کے محرم کے لئے یہ میرا پہلا خراج شکر گزاری تھا کہ میں یہاں کی فراوانی مسرت میں گھر اور نئی بیوی کی جدائی کو بھی تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا۔

۹۔ محرم کا سارا دن میں نے مجالسِ عزا میں شریک ہو کر بسر کیا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ سوز خوانی کا رواج یہاں سے تقریباً اُٹھ گیا ہے یعنی تنہا وہ چیز جو ایک صاحب ذوق کو ان محافل کی شرکت پر مجبور کر سکتی ہے وہی مفقود ہو گئی ہے۔ موجودہ مجالس کی

دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں صرف مرثیے تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں اور دوسری وہ جن میں "حدیث خوانی" ہوتی ہے۔ اول قسم کی محافل کا مقصود زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مرثیہ گو اپنی شاعری اپنی مرثیہ گوئی اور اپنی حرکات رقصیہ کی داد لے، اور دوسری قسم کی مجلس میں صرف فن خطابت کی تکمیل کی نمائش ہوتی ہے، لیکن میرے نزدیک دونوں نامکمل ہیں۔ اول الذکر میں شاعری کا جہاں تک تعلق ہے وہ ہر چند لکھنوی ذوق کے لحاظ سے بالکل مکمل چیز ہوتی ہے لیکن صحت روایات کے اعتبار سے سارا مرثیہ غیر معصوم لٹریچر کی حیثیت رکھتا ہے اور شہادت حسین پر جس انداز سے اظہار الم کیا جاتا ہے وہ "اہل بیت" سے تو کسی طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے کہ جان عالم کے مٹیا برج جاتے ہوئے اُنکے پسماندگان نے اس طرح شور و شیون کیا ہو۔ رہا پڑھنے کا انداز سو ممکن ہے کہ وہ کالکا دین، بندادین کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص فن کی چیز ہو لیکن میں نے تو بجائے حرکات شجاعت و تہور کے ایک قسم کی "نسائیت" اُن میں پائی۔

مجالس حدیث خوانی میں کوئی "مجتہد مولانا" جسے یہاں کی اصطلاح

"قبلہ و کعبہ" کہتے ہیں ممبر پر جا کر سب سے پہلے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھواتے ہیں، پھر کلام مجید کی کوئی آیت پڑھ کر اُس کے رموز و نکات بیان کئے جاتے ہیں، احادیث کی تلاوت کر کے اُن کا مفہوم بتایا جاتا ہے اور اخیر میں تمام وعظ کو، کھینچ تان کے فضیلت حُسین و شہادت حسین سے متعلق کر کے زور زور سے رانوں پر ہاتھ مار کر چیختے ہیں روتے ہیں، اور سُننے والے بھی آنکھوں پر رومال رکھ کر روتے وقت اس طرح بدن کو جنبش دیتے ہیں جیسے کوئی اُنھیں گدگدا رہا ہے۔

یہاں کے ایک خاص واعظ کا بیان بھی میں نے سُنا اور اُن کی تاویلات بیجا، اُن کے دلائل رکیکہ، اُن کی توجیہات سخیفہ اور تحریفاتِ قرآنی کو سُن کر حیران رہ گیا کہ اہل علم میں یہ بھی ہوا کرتا ہے۔

دریافت سے معلوم ہوا کہ تقریباً پورا سال یہاں اسی نوع کی مجالسِ ماتم و گریہ و زاری میں بسر ہوتا ہے حتیٰ کہ اظہار مسرت کا بھی یہی ایک طریقہ ہے، نسائی طبقہ میں جو "شبستان ماتم" قائم ہوتی ہے وہ بیشک ایک لطیف پہلو بھی رکھتی ہے، کیونکہ اول تو یوں ہی کسی عورت کا "نخل ماتم" بن جانا کم قیامت نہیں ہے چہ جائیکہ ایک خاص

سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر "خانہ بر انداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر ایک "آغوشِ طلب" انداز سے گر جانا ——— حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں "شہادت" کو زیادہ وزنی قرار دے یا اس "خوں بہا" کو۔

دس کی صبح کو چوک سے ضریح مبارک (میرے نزدیک اُس کا ترجمہ ذری کافی ہے) کا جلوس نکلنے والا تھا۔ صحیح وقت معلوم نہ تھا اسلئے وقت سے پہلے ہی وہاں پہونچ گیا۔

لکھنؤ کا چوک اپنی تنگی، مرطوب فضا، اور غیر صالح ماحول کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی معیوب حصّہ شہر کا کیوں نہ ہو لیکن حقیقی لکھنؤ اسی حصّہ آبادی کا نام ہے اور قدیم لکھنوی معاشرت کے نمونے صرف یہیں دیکھے جا سکتے ہیں، باوجود سڑک کی تنگی و تاریکی کے یہاں ایک خاص قسم کی عطریت محسوس ہوتی ہے اور نفس میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔

یہاں کے اکثر بالا خانے اس مخصوص طبقہ سے آباد ہیں کہ اگر اس

عنصر کو انسانی آبادی سے علٰحدہ کر دیا جائے تو دنیا میں سوائے مسجدوں کے اور کچھ نہ رہ جائے۔ معلوم نہیں اڈیٹر "ہمت" اسے "حسن رہگذر" میں شامل کرتا ہے یا نہیں، لیکن چونکہ میں اس کے وجوب کا قائل ہوں اس لئے اکبر کے اس فلسفہ پر کاربند ہو کر کہ :-

اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

بلا تشبیہہ "ارنی گوئے کوہ طور" کی طرح نگاہِ شوق سے ان پردوں میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوا جو اسوقت بالاخانوں پر پڑے تھے آگے بڑھا اور ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے ایک سڑک مغرب کی جانب جاتی ہے۔

میں تھک کر یا ہجوم سے گھبرا کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جو دفعتہً آنکھ اُٹھی تو دیکھتا کیا ہوں کہ غالب کی پوری مثنوی "چراغ دیر" مجسم سامنے موجود ہے۔

سامنے بالاخانہ پر ایک تنی ہوئی سفید چادر کی اوٹ سے دو ساحر مگر حزین و سوگوار آنکھوں نے مجھے ایک غلط انداز نگاہ سے دیکھا اور میرا آسمان و زمین سب کچھ اپنے ساتھ تک لے گئیں۔ لکھنؤ کا

یہ پہلا اور آخری بدیعۂ جمال تھا جس نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو نظیری کے ساتھ اس کے محبوب نے کیا تھا اور جس پر وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا تھا کہ:۔

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را
دیدیم زورِ بازوئے نا آزمودہ را!

معلوم ہوا کہ باندازۂ جمال و نزاکت وہ غنا و موسیقی کی بھی مالک ہے اور آنکھوں سے زیادہ افسوں اسکی آواز میں ہے اس خبر نے میرے حواس میں اور زیادہ تعطل کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور میں کھڑا ہوا اس عالمِ اضطراب میں سوچ رہا تھا کہ کوئی اہلِ ذوق ملے تو لکھنوی شاعری کے انداز میں اس سے یہ تو پوچھ لوں کہ "میرے دل کا مزار کس کے سایۂ دیوار میں بن رہا ہے" کہ اتفاق سے ایک ضعیف عورت جس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح بھی تھی میرے پاس سے گزری اور میری "چشمِ نگراں" کو دیکھ کر بولی کہ "میاں آج کے دن تو اوپر نہ دیکھو"۔

میں نے باادب عرض کیا کہ "بڑی بی اُن سے بھی تو کہو کہ آج کے

دن نیچے نہ دیکھیں"۔

اُس نے غضب آلود چتون سے مجھے دیکھنا شروع کیا، لیکن زری کے ساتھ جو ہجوم بڑھتا چلا آرہا تھا اس نے مجھے بچا لیا اور خبر نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گئی

زری کا جلوس کیا تھا؟ اس کا بیان اتنا ہی مہمل ہو گا جتنا اسکا اطناب، چند ہاتھی، چند اونٹ، کچھ جھنڈیاں، متعدد بینڈ، دو چار تعزیے اور ایک گھوڑا مع خون آلود ساز و براق کے۔ یہ تھی زری اور اُس کی جملہ کائنات۔ میں ان چیزوں کے فلسفہ سے واقف نہیں جس کو ضرورت ہو وہ اسی تاریخ کا ہمدم دیکھے جس میں جناب قمی جرنلسٹ نے ناڑہ سے لیکر نگاڑہ (نقارہ) تک ہر ایک کی بابت حد درجہ بالغ نظری سے کام لیکر تحقیق کے دریا بہا دئے ہیں۔

یہاں صبح سے دوپہر تک شیعوں کے تعزیے نکلتے ہیں اور دوپہر کے بعد سے سنّیوں کے۔ چونکہ دل و دماغ اک خاص خیال سے متاثر تھا اس لئے زری دیکھنے کے بعد میں نے آج کے تماشہ کو ختم کیا اور کربلا بھی نہ جا سکا حالانکہ یہاں کا خونی ماتم، یہاں کی واویلا دیکھنے کی چیز ہے۔

اس کے بعد میں نے چند دن یہاں کے اکابر سے ملنے اور یہاں کے مجالس شعر و سخن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اور قیام کیا، میں کس سے ملا، اُن کو کیسا پایا اور اُن کی شاعری کے متعلق کیا رائے قائم کی اسکی تفصیل آئندہ سطروں میں ملاحظہ فرمائیے۔

لکھنؤ کے محرم کا "ہنگامۂ مسرت" ختم ہونے کے بعد میرا خیال تھا کہ شاید کوئی "غیر معمولی سوگ" یہاں کی فضا میں پیدا ہو جائے گا اور مجھے اس "ماتمکدہ" کو جلد چھوڑ دینا پڑے گا، لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ یہاں کی آبادی خواہ کسی قدر اپنے سینوں کو فگار دکھانے کی کوشش کرے لیکن دلوں کے اندر ابھی تک وہی "نشاط غیر معصوم" موجزن ہے جس کی ابتدا اولین فرمانروائے اودھ کے عہد میں ہوئی اور انتہا آخری شاہ اودھ پر جو قیصر باغ کے ایک ایک حوض سے عُریاں نکلنے والی دوشیزہ کو "موج کوثر و تسنیم" میں ڈوبی ہوئی حور سمجھ کر "مال یغما" نہیں بلکہ "حصۂ مومن" کی حیثیت سے اُس پر قابض ہو جاتا تھا۔ اُس "فراموشِ فردا" عہد کے "ذرات منتشر" یہاں کی فضا میں اب بھی

بالکل اُسی طرح نظر آتے ہیں جیسے کسی رقاصہ کی محفل سے اُٹھ جانیکے بعد اُس کے زرکار ملبوس سے ٹوٹے ہوئے "بادلہ کے ریزے" کہیں کہیں فرش پر چمکتے ہوئے مل جائیں۔

یہاں کی آبادی کا دولت وجاہ والا "عنصر" وہ ہے جس کا اصطلاحی نام "تعلقہ داران اودھ" ہے اور جن میں ہندو مسلمان دونوں افراد شامل ہیں، اُن کی کوٹھیاں، اُن کے قصر، اُن کے مکانات لکھنؤ کے مختلف حصوں میں منتشر ہیں اور جب وہ اپنی دیہی زندگی کے بے آب ورنگ مشاغل سے تھک جاتے ہیں تو یہاں کی متمدن فضا میں آکر قیام کرتے ہیں اور تمام وہ "لوازم نشاط" جو دولت سے حاصل کئے جاسکتے ہیں ان کی دسترس سے باہر نہیں رہتے، ہر چند ان کی اقتصادی حالت قابل تعریف نہیں لیکن جس حد تک حکومت کے ساتھ وفادارانہ تعلق رکھنے کے بعد آزادیٔ اخلاق کا استحقاق پیدا ہوسکتا ہے وہ سب انھیں حاصل ہے اور اس کے لئے زرومال کی کمی کی شکایت انھیں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ صوبۂ اودھ میں اس جماعت کو وہی درجہ حاصل ہے جو روئے زیبا پر مصنوعی خال کا ہوا کرتا ہے کہ

بعض کے نزدیک وہ یکسر تصنع ناروا ہے اور بعض کے نزدیک "افزائش حسن"۔۔۔۔ میں نے بھی رات کیوقت ان "کاشانہائے حسن و جمال" کو برقی روشنی میں جگمگاتے دیکھا ہے اور خیال کی ایک مکمل کارگاہِ معصیت میں اپنے آپ کو مرکزی حیثیت دیکر پورالطف تصور بھی اٹھایا ہے۔ حیران ہوں کہ جن پر عیش و مسرت کی گھڑیاں اس انداز سے ہمیشہ گزرتی رہتی ہیں وہ زندہ کیونکر رہتے ہیں کیا سرمایہ و عمل کی جنگ یا اشتراکیت اجتماعیت کا اصول اسی نوع کی انتہائی غیر عادلانہ تقسیم فطرت کو دیکھ کر تو پیدا نہیں ہوا؟

یہاں کا دوسرا مخصوص طبقہ جو اپنے "سقوط راس" اور "ذرہ آفتاب تابانیم" دونوں حیثیتوں سے خالص لکھنوی ہے وثیقہ داروں کا ہے، جن میں بعض وہ ہستیاں بھی ہیں جو لاکھوں کی مالک ہیں اور بعض وہ متوکل نفوس بھی ہیں، جن کے اخلاق کا ارتقاء گداگری پر ختم ہو جاتا ہے متوسطین کی حالت گداگری سے بدتر ہے کہ اُن کے پاس حصول معاش کا یہ ذریعہ بھی نہیں اور وثیقہ کی تنگی انھیں جی کھول کر "افیون پیمائی" کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ ان کا ایک ایک بال قرض میں بندھا ہوا ہے غالب کی تنخواہ میں ساہوکار صرف تہائی کا شریک ہوا تھا مگر وہ دلی کی باتیں ہیں

اور دور گئی، یہاں لکھنؤ میں سا ہو کار تین چوتھائی سے زیادہ کا شریک ہے اور باقی چوتھائی حصہ "چنیا بیگم" کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا، "قدر کفاف" اور "سد رمق" کا کیا ذکر ہے؟ اس جماعت کی اخلاقی و معاشری حالت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دولت "مزد" کی حیثیت سے ہٹ کر صرف "دست غیب" یا "ترکہ" کی صورت میں ملتی ہے تو اُس میں کس قدر "عفونت و گندگی" پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ بہو بیگم کی تعریف کرتے ہیں کہ لاکھوں کا وثیقہ اُن کی ذات سے لوگوں کو ملا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اس سے زیادہ ظلم اہل لکھنؤ پر کوئی اور کر ہی نہ سکتی تھیں کہ اتنی بڑی جماعت کو بیکار و بے دست و پا بنا کے رکھ دیا، اہل لکھنؤ کی پست ذہنیت کا بڑا سبب یہی "غلط بخشی" ہے اور یہ جو لکھنؤ سے باہر ہر جگہ یہاں کا زنانہ پن بدنام ہے اس کی علت بھی اسی کو قرار دے سکتے ہیں جس نے قوائے عمل بیکار کر کے عورتوں کی سی مجہول زندگی کا عادی بنا دیا ہے۔

میں یہاں کے ایک بڑے وثیقہ دار سے ملنے گیا جن کی آمدنی گانوں اور وثیقہ کی ملا کر ایک ہزار سے کم نہیں ہے، آبا و اجداد کا چھوڑا ہوا ایک عالیشان قصر بھی ہے، موٹر بھی رکھتے ہیں، حاجب و دربان بھی

موجود ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ان کے مکان کی فضا، وہاں کا ماحول، اور ایک ایک چیز پہ ادبار کا گہرا سوگ برس رہا ہے اور وہاں پہنچتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید خون کی روانی رگوں کے اندر کم ہو گئی ہے اور غنودگی سی روح پر طاری ہو رہی ہے' ان کے یہاں کی محافل اسمیں شک نہیں کہ بڑی حد تک اُن کے اسلاف کی یادگار ہیں' وہی کبوتر اور بٹیر کی لت، وہی فسانۂ آزاد کے صف شکن خاں بٹیر کی تعریف کرنے والے مصاحبوں کا گروہ، وہی ارباب نشاط کا ہجوم اور وہی ذوقِ رقص و موسیقی، لیکن چونکہ روح حقیقی نشاط سے خالی ہے' اس لئے یہ تمام سماں بجائے مسرور کرنے کے میرے دل کو دکھا رہا تھا اور حیران تھا کہ یہ لوگ جنھوں نے تمام عمر میں ایک دن بھی اپنے جسم و دماغ کو محنت سے تھکا کر تفریح کے لئے آمادہ نہیں کیا کس طرح اس سے لطف حاصل کر سکتے ہیں اور کیوں نہیں وہ ان تمام اسباب عیش و تفریح سے بیزار ہو کر خودکشی کر لیتے۔ اس مختصر سی صحبت میں کبوتروں کے عجیب و غریب نام، اُن کے سیکڑوں اقسام، فن کبوتر بازی کی اصطلاحیں، بٹیر بازی کے بہت سے رموز و نکات، موسیقی کے متعدد دل تڑپا دینے والے ٹکڑے

مصاحبوں کی خالص لکھنوی ذہنیت کا پتہ دینے والی لکھنوی ٹکسالی زبان سبھی کچھ میں نے دیکھا اور سُنا، لیکن بالکل سرمایۂ اعتبار و بصیرت سمجھ کر اور پھر مجھ میں ہمت نہ ہوئی کہ دوبارہ اس المناک مسرت کا اذیت کوش لطف حاصل کروں۔

یہاں کے وثیقہ داروں کی جماعت خواہ وہ ایک ہزار کا وثیقہ یاب ہو، یا ایک روپیہ کا یکساں طور پر ایک ہی نسبت سے مقروض ہے اور شب و روز ڈگریوں کے خوف سے مکان کے اندر مقفل رہنا اس طبقہ کی مشہور خصوصیت ہے۔ صبح کو بالائی اور باقر خانی کا ناشتہ کرنا اور شام کو تھیٹر جانا (اگر بد قسمتی سے کوئی تھیٹر موجود ہو) خواہ بیگم کا کلی دار پائجامہ ہی کیوں نہ فروخت کرنا پڑے مشاہدات روزانہ میں داخل ہے جہانتک غذا کا تعلق ہے فصلی چیزوں کے باب میں ان کی نزاکت "سوءِ ہضم" کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اور یہاں کا نازک سے نازک نواب بھی جس کے متعلق مشہور ہے کہ مولی کا پتّا بھی پاؤں کے نیچے آ کر اُس کے لئے زکام کا باعث ہو جاتا ہے، جس وقت گاجر، سنگھاڑا، شکر قند کھانے پر آجاتا ہے، تو محکمۂ حفظانِ صحت کے ملازموں کے لئے ایسا معمولی ڈھیر

چھلکوں کا نہیں چھوڑ جاتا کہ ان کی طرف سے تن آسانی کی شکایت پیدا ہو سکے۔ لباس یہاں کی تمام لکھنوی آبادی کا تقریباً ایک ہی سا ہے، دوپلّی سفید ٹوپی جس سے مقصود صرف مانگ کا چھپانا ہے۔ فیلبان سے لیکر فیل نشین تک ہر ایک کے سر پر نظر آتی ہے۔ اچکن کا رواج بھی کثرت سے ہے لیکن بڑے پائنچے اب کم نظر آتے ہیں، اُسکی جگہ چوڑیدار پائجامہ نے لے لی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان کی وضع سے ایک نوع کی نسائیت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ علی الخصوص اُسوقت جب وہ فرط نزاکت سے "زیر قدامت ہزار جا نشست" کسے قسم کی چال دکھانے پر آجائیں۔ یہاں سلام کرنے کا بالکل مخصوص انداز ہے، سر و گردن کے ایک ایسے خم کے ساتھ جو پشت تک پہنچ جاتا ہے، داہنے ہاتھ کو سینے کے محاذ میں لاکر ہتھیلی اور انگلیوں کو پورا پھیلا کر گردن تان کر کلائی کے جوڑ کو ڈھیلا کر کے مسلسل کئی بار جلدی جلدی جنبش دیتے ہیں اور اس طرح سارے ہاتھ میں تھرتھری پیدا کرنے کو رسم سلام سے تعبیر کیا جاتا ہے میں نے غور کیا کہ کہیں میرزا مظہر جانجاناں نے اسی "ادائے کورنش" کا ذکر تو اس شعر میں نہیں کیا۔

سر از یں تیغ بردن آسان نیست
آہ ! منظر خمیم سلام کسے

لیکن میں مطمئن نہ ہو سکا کہ لکھنؤ کی اندازِ سلام واقعی اس حد تک دلربا ہے ہاتھ جوڑ کر حد درجہ اظہار عجز وانکسار کے ساتھ بات بات میں "قبلہ حضور" کے الفاظ سے خطاب کرنا یہاں آداب گفتگو کی خصوصیت میں داخل ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک مردم فریب بھی ہے، لیکن تجربہ کرنے کے بعد وہ ایک غیر حقیقی نمائش سے زیادہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

یوں تو ہر جگہ انسان کی اندرونی اور بیرونی اخلاق و معاشرت میں فرق ہوتا ہے لیکن لکھنؤ میں یہ فرق حد سے متجاوز ہے، آپ ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے چوک سے گزر رہا ہے اور آپ اس کی صفائی سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن اسکا گھر کسی طرح مزبلہ سے کم نہ ہوگا، اور وہاں کی ایک ایک چیز سے آپ کو اس کی گندگی و عفونت کا ثبوت ملے گا، آپ دوسرے شخص کو دیکھتے ہیں کہ نہایت ہی انکسار سے ہاتھ جوڑ کر گفتگو کر رہا ہے، لیکن

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک لفظ بھی صحیح معنی میں استعمال نہیں کرتا اور آپ سے جدا ہونے کے بعد اتنی ہی گالیاں دیگا جتنی تعریف آپکے سامنے کر گیا ہے۔ یہاں کی معاشرت میں کذب و دروغ، مکر و فریب اس درجہ سرایت کر گیا ہے کہ اس کے معیوب ہونے کا احساس ہی محو ہو گیا ہے اور وہ اس طرح کام نکال لینے کو فراست و ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں کے معمولی سودا بیچنے والوں کا یہ حال ہے کہ جس چیز کی قیمت وہ پانچ روپیہ کہہ رہے ہیں اُس کو وہ نہایت آسانی سے ایک روپیہ بلکہ اس سے بھی کم میں دیدیں گے۔ چنانچہ یہاں کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک اجنبی نخاس گئے وہاں ایک آدمی ٹوپی کا پلّہ بیچ رہا تھا، وہ ان کی وضع وصورت دیکھ کر بھانپ گیا کہ اجنبی (یا لکھنوی زبان میں گنوار) ہیں، اُنھوں نے پلّے کی قیمت دریافت کی، اُس نے تمام اپنی دلفریب اداؤں کے ساتھ کہا کہ:-

"حضور یہ پلّہ ہے تو نہایت قیمتی۔ یار کے محمد علی خاں کے ہاتھ کا کشید کیا ہوا اور انھیں کے صاحبزادے میاں احمد علی کے ہاتھ کا کڑھا ہوا ہے حضور شاید واقف ہوں گے کہ یہ محمد علیخاں وہی ہیں جن کے کشید

سکئے ہوئے اور کاڑھے ہوئے رومال ولایت جاکر ہزاروں میں بکتے ہیں۔ وقت پڑ گیا ہے اس لئے جدا کر رہا ہوں، ورنہ اسی قسم کے پلّے کل ہی منّولال بزّاز نے ایک رئیس کے ہاتھ دس دس روپیہ میں بیچے ہیں، آپ سے میں صرف پانچ روپیہ لے لونگا، ذرا حضور ملاحظہ تو فرمائیں کہ کیا چیز ہے، ایک ایک پتّی منھ سے بول رہی ہے، پلّہ کیا ہے چمن کھلا ہوا ہے"۔

وہ غریب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد چلے گئے، کچھ دور چلے ہوں گے کہ اُس نے پھر آواز دی کہ "اے کیا آپ خفا ہو گئے، اچھا تو یاروں کی چھوٹ بھی دیکھتے جائیے، اور آٹھ ہی آنے دلوائیے"۔ وہ حیران رہ گیا کہ یہ کیا تماشہ ہے اور لوٹ کر قیمت ادا کی اور پلّہ لے لیا جب وہ جانے لگا تو اس نے ہنس کر کہا کہ "آپ مجھ پر افسوس نہ کریں اس رقم میں بھی چار آنے یاروں کے کہیں نہیں گئے"۔

یہ قصّہ غلط ہو یا صحیح لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی ذہنیت کیا ہے، اور اہل لکھنؤ سے معاملہ کرنا کس قدر خطرناک بات ہے۔

لکھنؤ کے دو حصّے ہیں ایک مشرقی جو امین آباد سے شروع ہو کر حضرت گنج بلکہ صدر تک چلا گیا ہے اور دوسرا مغربی حصہ جو رکاب گنج سے شروع ہو کر قریب قریب سعادت گنج تک چلا گیا ہے پہلا حصّہ وہ ہے جسے اہل لکھنؤ لکھنؤ سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور یہاں کی آبادی کو گھسیاروں، خانساماؤں کی آبادی کہتے ہیں۔ مغربی حصہ خالص لکھنؤ کہلاتا ہے اور نوابوں، وثیقہ داروں، طبیبوں، شاعروں، افیونیوں اور دستکاروں کی آبادی اس حصہ میں زیادہ ہے اور بہت سے لکھنوی تجربات یہیں کی گلیوں کی خاک چھاننے سے حاصل ہوتے ہیں، اس حصہ میں امام باڑے اور عزا خانے بھی ہیں، یہیں بٹیروں کی پالیاں قائم ہوتی ہیں اسی جگہ کنکوے لڑتے ہیں اور یہیں شیعہ سُنّی علماء کا مخزن ہے۔

ہر چند مجھے اس حصّہ کے مطالعہ کا کم وقت ملا، لیکن اس قلیل فرصت میں بھی یہ نتیجہ نکالنا میرے لئے دشوار نہ تھا کہ وہ جراثیم جو نوابانِ اودھ کے عہد میں پیدا ہو گئے تھے وہ ہنوز مختلف صورتوں میں یہاں پائے جاتے ہیں اور تا وقتیکہ یہ سارا حصہ برابر نہ کر دیا جائے بقول آتش "زمین کے نشیب و فراز کا دھبّہ مٹنا" بالکل محال ہے لیکن

اسی کے ساتھ اگر زندگی کا صرف لاعبانہ پہلو پیش نظر ہو تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

اہل لکھنؤ کی گفتگو یقیناً اہل دہلی سے زیادہ شائستہ، شگفتہ، نرم اور دلچسپ ہوتی ہے۔ دہلی پنجاب کے لب ولہجہ سے متاثر ہو کر اپنی خصوصیات زبان کو کھو چکی ہے اور لکھنؤ باوجود اس کے کہ بڑا حصہ یہاں کی آبادی کا دہقانیوں اور پوربیوں پر مشتمل ہے ابھی تک اپنی خصوصیات زبان کو سنبھالے ہوئے ہے لیکن غلطی ہو گی اگر اس زبان کو علمی درجہ دیا جائے یا اس کو شعر و شاعری میں استناداً پیش کیا جائے کیونکہ ہر ملک کی علمی زبان بازاری یا کاروباری زبان سے علیحدہ ہوتی ہے اور شاعری کی لطافت خیال بھی ایک مخصوص انداز کی محتاج ہے جس کو روزمرہ یا کسی مختص المقام محاورہ سے صرف اس حد تک سروکار ہو سکتا ہے کہ شعر خود کوئی اصطلاحی حیثیت نہ اختیار کرے۔

میں ہر چند شاعر نہیں ہوں لیکن عالم بالا سے زیادہ "شعر فہمی" کا مدعی ضرور ہوں اور اس بنا پر اگر لکھنؤ آنے کے بعد میرے اندر یہاں کے

محافلِ شعر و ادب، یہاں کے اکابر شعراء سے ملنے کا ولولہ پیدا ہوا تو بیجا نہ تھا، یوں تو رسائل کے ذریعہ سے میں یہاں کے بعض شعراء و اہلِ قلم سے واقف ہو چکا تھا لیکن اب جی چاہتا تھا کہ اُن سے ملوں، ان کی باتیں سنوں اور ان کا مطالعہ زیادہ قریب سے کر کے کسی نتیجہ پر پہونچوں اجنبی ہونے کی حیثیت سے مجھے اس کی تکمیل میں ضرور کچھ نہ کچھ دشواریاں اٹھانا پڑیں، لیکن نہ اس قدر کہ ان کا ذکر ضروری ہو۔

شام کا وقت تھا، امین آباد کے سبزہ پر تنہا بیٹھا ہوا صبح آئندہ کا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ دو صاحب جن میں سے ایک دُہرے بدن کے اوسط قد والے اور دوسرے اکہرے جسم کے پستہ قامت شخص تھے مجھ سے کچھ دور آکر بیٹھ گئے اور گفتگو کرنے لگے، انکی گفتگو کا موضوع یکسر ادبی تھا اور وہ کسی غزل پر تنقید کر رہے تھے۔ میں جسارت کر کے اٹھا اور قریب جا کر عرض کیا کہ :۔

"اگر دو شاعروں کے درمیان کسی غیر شاعر وجود کو برداشت کیا جا سکتا ہے تو براہ کرم مجھے اجازت دیجئے کہ قریب سے آپ حضرات کی گفتگو سنوں اور نو وارد سیاح ہونے کی حیثیت سے آپکی اعانت چاہوں"۔

اس کا جواب وہی ملا جو ملنا چاہیئے لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے، انھوں نے خود میرے حال کی تحقیق شروع کر دی، میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ :-

"میرا نام لیخسمدر ہے، کرۂ مریخ کے ایک شہر سنتکار کا رہنے والا ہوں، آج ہی صبح بغرض سیاحت مافوق الفطرت شعاعوں پر سوار ہو کر یہاں آیا، تمام دن اس کوشش میں صرف ہو گیا کہ انسان بن کر باہر نکلوں کرۂ زمین کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے تفریح کروں لیکن پہلے تو گھنٹوں یہی فیصلہ نہ کر سکا کہ یہاں کی بہترین معیاری صورت انسانی کیا ہوتی ہے۔ کبھی ضرورت سے زیادہ ناک لمبی ہو گئی کبھی دہانہ ایک کان سے دوسرے کان تک پھٹ کر رہ گیا، کبھی ابرو آنکھ کے نیچے بن گئی اور کبھی ہونٹوں کے اوپر، الغرض بڑا وقت تو اسی تعمیری کام میں خراب ہوا، آخر کار میں نے یہ فیصلہ کیا آنکھ بند کر کے بیٹھ جاؤ اور پھر آنکھ کھولنے کے بعد جو شخص سب سے پہلے نظر آجائے اس کا نمونہ تیار کر دو، ہر چند میرا یہ فیصلہ درست نہ تھا کیونکہ جس وقت میں نے اس پر عمل کر کے اپنے آپ کو انسان بنایا اور سڑک پر نکلا تو

کسی نے پشت سے آواز دی کہ "جالب صاحب، جالب صاحب" اور اب میں سمجھا کہ کسی دوسرے کی صورت بنانا بڑی ذمہ داری کا کام ہے اس لئے میں گھبرا کر ایک گلی میں ہو گیا اور خود ہی اپنی ذہانت سے کام لیکر دوسری فرضی صورت اختیار کر کے یہاں بیٹھا ہی تھا کہ آپ حضرات تشریف لے آئے"۔

میں نے یہ گفتگو صرف اس لئے کی تھی کہ تمام منازل تکلف دفعۃً دور ہو جائیں اور میں جلد سے جلد اُن کی آزاد صحبت و گفتگو میں شریک ہو سکوں۔

چنانچہ میں اس میں کامیاب ہوا اور اسی وقت شام کو اُنہیں سے ایک صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے اور دیر تک اُن سے گفتگو ہونے کے بعد یہاں کے شعراء سے ملنے کا پروگرام تیار کیا۔

قبل اس کے کہ میں لکھنؤ کے موجودہ شاعروں کے متعلق گفتگو کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً یہاں کی شاعری کی وضع و ترکیب پر اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔

اس وقت تک عام طور پر لکھنؤ و دہلی کی شاعری کے متعلق بحث کا جو پہلو اختیار کیا گیا ہے وہ بہت سطحی ہے اور سوائے اس کے کہ چند پیش افتادہ باتیں دونوں جگہ شاعری کی تمیز و تفریق کے لئے بیان کر دی جائیں، کوئی ایسی اصولی بحث اختیار نہیں کی گئی جو اس تفریق و امتیاز کے اسباب کو بھی سامنے لے آئے اور ہر شخص اُن کو دیکھ کر از خود فیصلہ کر سکے کہ ان دونوں میں حقیقتاً وجہ امتیاز کیا ہے اور کن وجوہ کی بنا پر ایک کو دوسرے پر مرجّح قرار دیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ لکھنؤ کی کوئی قدیم آبادی نہیں ہے بلکہ لکھنؤ کا وجود اپنی تمام "لکھنویت" کے ساتھ ایک استعارہ ہے فیض آباد سے جو نوابان اودھ کا اولین مہبط تھا، اب اسی کے ساتھ آپ حکومت اودھ کی تاریخ پر بھی غور کیجئے کہ اس کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی ہے۔ یہ امر شاید کسی سے مخفی نہیں کہ شاہان دہلی سے بغاوت و انحراف کا نام حکومت اودھ ہے اور برطانیہ کی بساط سیاست پر ایک شاطرانہ چال بنیاد ہے شاہان اودھ کے وجود کی۔

جس طرح سلطنت مغلیہ کے دوسرے وفادار اور نمک حلال

عمال دیگر اکناف ہند میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کر کے دادِ وفا دے چکے تھے اسی طرح نواب سعادت علی خاں بانی حکومت اودھ نے اپنی ذہنیت کا ثبوت دیا اور چونکہ حکومت برطانیہ کلیتہً دہلی کا اقتدار مٹا دینا چاہتی تھی اس لئے آخر کار "غازی الدین حیدر" کو شاہ کا لقب دیکر گویا یہ خصوصیت بھی دہلی کی چھین لی۔ اس لئے اگر فرمانروایان اودھ کے دلوں میں شروع ہی سے دہلی اور دہلویت سے تنفّر رہا ہو اور یہاں کی فضا میں اس جذبہ کے زیر اثر لوگوں نے پرورش پائی ہو تو جائے حیرت نہیں، پھر اگر آپ دونوں جگہ کے اخلاق و معاشرت تہذیب و تمدن، وضع و ملبوس، خیال و زبان پر غائر نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ نے قصد کر کے دہلی کی ہر بات کو محو کرنا چاہا حتیٰ کہ اگر دہلی والے کسی لفظ کو مذکر بولتے ہیں تو اہل لکھنؤ نے اُسے مؤنث بنا کر چھوڑا، اس مغائرت کا ایک سبب تو یہ تھا اور دوسرا بڑا سبب مذہب تھا جو حقیقتاً تاریخ اودھ کی داستان کا نہایت ہی دردناک ٹکڑا ہے، میں اس کی تفصیل سے لطیف طبائع کو منغص کرنا نہیں چاہتا جن حضرات کو اس کے جزئیات کا علم حاصل کرنا مقصود ہو وہ تاریخ کی

کتابوں میں جستجو کریں، لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ حکومت اودھ کی ساری تاریخ گویا ایران کے عہد صفوی کی تاریخ ہے اور مذہبی تنگ نظری کی وہ تمام صورتیں جو ایک انسان کو مذہب کا بھی دشمن بنا دیتی ہیں پوری قوت کے ساتھ لکھنؤ میں ہر جگہ پائی جاتی تھیں ایران کے دَورِ صفوی میں تو صرف اس قدر ہوا کہ شاعری صرف مرثیہ گوئی ہو کر رہ گئی، لیکن لکھنؤ کی شاعری نام تھا اُن عفونتوں اور گندگیوں کا جو ادباشانہ اخلاق کا جزو لازم ہیں اور تمام اُن رکیک و نحیف اور رذیل و دنی جذبات کا جو صرف ایک گناہ گار اور سیاہ کار دل ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ماحول کا اثر شاعری پر ہونا لازم ہے، تو ایک ملک و قوم کی شاعری کو دیکھ کر اس کے ماحول کا اندازہ کرنا بھی لازم منطقی نتیجہ ہے پھر خواہ آپ سلطنت اودھ کے سیاسی، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی شاعری کا مطالعہ کیجئے یا اُس عہد کی شاعری سے آپ اُس زمانہ کے اخلاق پر حکم لگائیے نتیجہ ایک ہی نکلے گا، اور وہ یہ کہ لکھنؤ کا وہ دَور جسے یہاں کا عہدِ زرّیں کہا جاتا ہے

اپنے ذہنی و دماغی انحطاط، اخلاقی و معاشرتی زوال، مذہبی گندگی و تنگ نظری بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اپنی حیوانیت و درندگی اور وحشت و سبعیت کے لحاظ سے ایک ایسا عبرت ناک دور انحطاط تھا کہ شاید ہی اس کی کوئی دوسری مثال دنیا کی تاریخ میں پیش کیجا سکے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت خواہ کتنی ہی حسرت کے ساتھ یہاں کی رنگ رلیوں کا ذکر کیوں نہ کریں، عیدین کے موقع پر شاہانہ جلوس اور اُس کے تزک و احتشام کا فسانہ خواہ کسی زبان و انشاء میں کیوں نہ تحریر فرمائیں لیکن دنیا اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ اسی لکھنؤ میں شہر کے اکابر و امراء کی حسین لڑکیاں محرم کی روضہ خوانیوں، عزاداریوں اور تمثیل سازیوں میں ائمہ اطہار کی بیویاں بنا بنا کر پیش کی جاتی تھیں اور یہاں کا عظیم المرتبت اور شوکت و جبروت والا بادشاہ اچھوتیوں کے ساتھ خود بھی دردزہ میں مبتلا رہنے کے بعد کسی نہ کسی امام زادہ کو (مومی شبیہ چینی کی مورت یا گڑیا کی صورت میں) جنا کرتا تھا، اور جب "مبارک سلامت" کے ترانے گائے جانے تھے تو وہ ایک نو عروس کی طرح گھونگٹ کر کے بیٹھ جاتا تھا اور جب عالم نشاط کی فراوانی سے مجبور ہو جاتا تو خود بھی کنچنیوں، پاتروں اور

کسبیوں کے ساتھ مل کر اپنی بھدی کمر میں "لرزش رقصانہ" اور عفریتی جسم میں "جنبش رامشگرانہ" پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس ملک کا فرمانروا اس رنگ کا رہا ہو، جسکی نفس پرست زندگی نے حلال وحرام کا پردۂ تمیز اٹھا دیا ہو، جس نے اپنی زندگی کا "اُسوۂ حسنہ" یہ پیش کیا ہو، وہاں کی رعایا کی اخلاقی حالت کا کیا عالم ہوگا اور ان کی حیوانیت "اِرتقا" کے کس دور میں رہی ہوگی، پھر یہ برکات صرف کسی ایک کے عہد سے مخصوص نہ تھے بلکہ اودھ کا ہر حکمران کم وبیش یہی ذہنیت لے کر آیا تھا اور کسی نہ کسی اخلاقی پستی کا مظہر اتم ہونے کی خصوصیت کبریٰ اُسے حاصل تھی۔

اگر شاعری نام ہے جذبات کے اظہار کا اور جذبات پیدا ہوتے ہیں خود اپنے اور ماحول کے معاشرتی واخلاقی حالات سے تو ہر شخص بہ آسانی حکم لگا سکتا ہے کہ لکھنوی شاعری کو کیا ہونا چاہیئے اور اسکی حقیقت کیا ہو سکتی ہے، مثلاً ناسخ کے ایک مشہور شاگرد شیخ امان علی سحر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

استخارہ جو سحر وصل پہ واجب آیا مسکرا کر وہی کمبخت مرے منھ پہ مارا

استخارہ ایک مذہبی عمل ہے لیکن اس کو اخلاق کی پستی کہئے یا مذہبی زندگی کا غلو کہ "بے اختیاری شوق" کے عالم میں وصل کیلئے استخارہ کیا جاتا ہے (گویا وہ بڑا عمل خیر ہے) اور شاعر "واجب آیا" کہہ کر اُسے ایک اور درجۂ ترقی پر پہنچا دیتا ہے البتہ دوسرے مصرعہ میں جس معشوقانہ ادا کا اظہار ہے وہ بجائے خود ایسی چیز ہے کہ کنٹھا کہے یا نہ کہے وصل کا فرض کی صورت اختیار کر لینا یقینی ہے۔

میرے نزدیک شاعری کے تمام اصناف میں "غزل گوئی" جس قدر بلند چیز ہے کوئی نہیں، روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقاء تصوف ہے (تصوف سے مراد عہد حاضر کی قبر پرست، مرید ساز، خرقۂ مکر و سالوس والی درویشی نہیں ہے بلکہ میری مراد علوئے فطرت وہ عروج روح، اور وہ استعلار تصور ہے جہاں انسان مادیت سے گزر کر اپنے حیز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن میں امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے) پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی

اول منزل میں بھی جو یقیناً "منزل لب بام" ہی ہوا کرتی ہے، شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے، انتہائی منزل کے حصول سے غافل نہیں ہوتا اور دنیاوی زیر و بم میں بھی اس نغمۂ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر ساعت، ہر لحظہ، ہر دم اُس کو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہیں بڑھتا اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بیدل کے مرتبہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں۔ لیکن ایک فطری شاعری خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل میں کیوں نہ ہو، اُس سوز و گداز، اُس درد و تاثیر، اُس عذوبت بیان، اُس حلاوت زبان اور اُس حقیقت و صداقت سے خالی نہیں ہو سکتی جو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہیں کیجا سکتی۔

پھر غور کیجئے کہ اس دورِ حکومت کی شاعری جو غدّاری کورنگی اور جذبۂ نفرت و استکراہ پر قائم ہوئی ہو اور اِس عہد معصیت کی شاعری جس میں ادنیٰ و ذلیل درجہ کے حیوانی جذبات کے سوا کسی جذبۂ بلند کی پرورش کی فضا نہ پیدا ہوئی ہو اور اُس زمانۂ فسق و فجور کی شاعری جب

مذہبی استخفاف، اور بے حیائی و بے غیرتی اس حد تک پہونچ جائے
کہ وصل کے لئے استخارہ کا کنٹھا سنبھالنا بھی معیوب نہ رہے یعنی انیسویں
صدی کے نصف اوّل کی وہ لکھنوی شاعری جس نے اسی ماحول، اسی
ذہنی پستی، اسی اخلاقی فرومایگی، اسی مذہبی تنگ نظری اور اسی ہیجان بددیتی
میں آنکھ کھولی ہو وہ ناسخ و وزیر ہی پیدا کر سکتی تھی نہ کہ مومن و میر،
اسمیں سحر و صبا ہی کی تخلیق کی اہلیت ہو سکتی تھی نہ کہ درد و قائم کی۔

لکھنؤ کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی، چوٹی، انگیا،
آنچل، آرسی، سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کی بہت سی
سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ اُسوقت
کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی تھی اور رات دن اُن کو اُنھیں
چیزوں سے واسطہ تھا اور انھیں پر اُن کے نشاط کی بنیاد قائم تھی،
ان کی شاعری کا موضوع عہد وحشت کی وہ عورت تھی جب اس سے
صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور جس کو اسباب آرائش و زیبائش
کی دوسری کم مایہ جنسوں کی طرح قابل بیع و شری جنس قرار دے دیا
گیا تھا، لکھنؤ کی سرزمین میں قصر شاہی سے لیکر فقیر کے جھونپڑے تک

یکساں طور پر جذبۂ شہوت پرستی کارفرما تھا، نہ فرمانرواؤں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہ گیا تھا اور نہ رعایا کو تحسین تمدن کا، ہر شخص اپنی جگہ عیش کوشی ونشاط اندوزی میں مصروف ومنہمک تھا اور نسائیت جو معصیت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے بلاتفریق ہر طبقہ کے مردوں میں پیدا ہوتی جارہی تھی، سرکار انگریزی نے شاہ و رعایا سب سے عسکری روح چھین لی تھی اور اُن کے جذبات عزت وشجاعت کو صرف بٹیر بازی، کنکوے بازی اور تیتر بازی میں تبدیل کردیا تھا اور وہ بالکل غیر معلوم و غیر محسوس طور پر انسانیت کی اس نیچی سطح پر آرہے تھے جو حیوانیت تک پہونچنے کے لئے حدِّ فاصل درمیان نہیں رکھتی۔ اسی لئے لکھنؤ کا شاعر کبھی ایک یاوہ گو ناظم، ایک ہرزہ سرا متشاعر، ایک بوالہوس حُسن پرست، ایک بازاری فقرہ باز، ایک عامی پھبتی گو، ایک سوقی عیاش کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھ سکتا تھا کیونکہ ماحول کا اقتضا یہی تھا۔

اہل لکھنؤ کا دعویٰ ہے کہ زبان کو جو ترقی یہاں ہوئی کسی جگہ نہیں ہوئی، یہاں تک کہ شعرائے دہلی نے بھی یہیں آکر یا یہاں کی زبان کو سامنے رکھ کر اپنی زبان کی موچ نکالی۔ اوّل تو مجھے اسی میں گفتگو ہے

کہ یہاں کی زبان کو ترقی ہوئی۔ کیونکہ زبان کی ترقی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ بلند سے بلند خیال کے اظہار پر قادر ہو جائے اور اس کی ایک مثال بھی یہاں کے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ البتہ عیاشانہ اور بازاری زبان نے یہاں ضرور ترقی کی اور عامیانہ خیالات کے اظہار کے لئے بیشک بہت سے جدید اسلوب پیدا کر دیے چنانچہ آج بھی یہاں کا سنجیدہ سے سنجیدہ نقاد ایک شعر کی داد دیتے وقت کبھی اُس کو زہریلا بنا دیتا ہے کبھی اس کے دھوئیں کو مادر اسر حد محفل بل کھاتا ہوا پاتا ہے، کہیں اس کے "کس بل" کو نمایاں کرتا ہے اور کہیں "اے توبہ" "اُوئی اللہ" کہہ کر اس کی داد دیتا ہے ——

اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لکھنؤ نے زبان اور محاوروں کو درست کیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعری اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ غزل کو اس سے کیا فائدہ پہونچا جو قطعاً ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہے، غزل کی زبان کبھی پہلے نہیں بنتی، بلکہ غزل گو کے خیالات کے ساتھ پیدا ہوتی ہے وہ زبان کی پابند نہیں ہے بلکہ خود زبان اسکی محتاج ہے۔ اگر ناسخ نے جو لکھنوی شاعری کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے

بہت سے محاورات اپنے دیوان میں نظم کر دئیے، صحت الفاظ کا بہت خیال رکھا تو نتیجہ کیا ہوا یہی نا کہ وقت ضرورت اس سے ایک لغت یا فرہنگ کا کام لے لیں، غزل گوئی کو اس سے کیا فائدہ پہونچا۔ محاورے اس نے جتنے بھی لکھے ہوں لیکن غزل اُس کی ان حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔

سخت دل جو ہیں انھیں محروم رکھتا ہی فلک ۔ بیضۂ فولاد سے بچّہ کہاں پیدا ہوا

نہیں آتا نظر مرہم لگائے کس جگہ کوئی ۔ وہاں یار گویا منھ ہے میرے زخم پنہاں کا

جب وہ مسجد میں ادا کرتے ہیں ۔ سب نماز اپنی قضا کرتے ہیں

میرے نزدیک لکھنوی شاعری عبارت ہے ناسخ، آتش، مصحفی اور اُن کے شاگردوں کے کلام سے، ناسخ کے کلام کی بے نمکی اور اُس کا "شعر" کی تعریف سے یکسر علیحدہ ہونا کسی سے مخفی نہیں، ناسخ کے جتنے مشہور شاگرد ہوئے وہ بھی اس باب میں اپنے اُستاد سے کسی طرح کم نہ تھے، چنانچہ امداد علی بحر، شیخ امان علی سحر

خواجہ وزیر کا کلام اُٹھا کر دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان غریبوں میں کبھی جھوٹی محبت کا بھی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔

سحر کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

خوشبو میں کیا ہیں داغ محبت کے اُبھرے — سر ہے کہ دوش پر ہے قرابہ گلاب کا
افسوس ہم نے خطِ غلامی دیا اُسے — لکھوا لیا نہ اُس سے مچلکا رقیب کا
اے سحر نہ لے عارضِ محبوب کا بوسہ — شبہ ہے مجھے کان کی بجلی پہ مگر کا
بیمار ہوں خوبصورتوں کا — حسنِ یوسف مری دوا ہے

سحر کی شاعری میں ایک تو وہی کنٹھے والا شعر ہے، دو چار نوادر اور ملاحظہ ہوں:-

طائرِ روح کو دانے پہ لگایا قاتل — دل پہ ہم نے تری بندوق کا چھرا کھایا
دوڑ کر ابروِ قاتل کی بلائیں لے لیں — بیٹھے بٹھلائے اُٹھے ہاتھ میں چھرا کھایا
مسکرا کر وصل میں جب دانت پیسے یار نے — موجِ خندہ بن گئی زنجیر موتی چور کی

وزیر کی لفظ پیمائیاں بھی سنئے:-

گرمیاں کیں اسقدر ہر عضو شعلہ ہو گیا — شب کو روشن یار کے بازو کا اکّا ہو گیا
بدن میں یہ میرے جتنے زخم ہیں آنکھیں چراتے ہیں — نہ پوچھو کس قدر پیاسا ہوں آبِ تیغِ قاتل کا

گردِ مشقِ خیالِ خطِ جاناں ہوگا　　پھر تو جو خط میں لکھوں گا خطِ ریحاں ہوگا

شاعری کا جہاں تک تعلق ہے آتش یقیناً ناسخ سے بدرجہا بہتر ہے لیکن "لکھنوی خصوصیت" اُس کے کلام میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔

دیدۂ یار کہیں کیا اسے کیفِ مے میں　　بھون کر روز گزک کرتے ہیں بادام کو ہم
چلے تو سیر کو ہیں آپ مستی مل کے گلشن میں　　اشارے کیسے کیسے ہونگے نافرمانؔ و سوسن میں
یادِ رخسارِ کتابی جو رہا کرتی ہے　　دل سمجھتا ہے مرا حافظ قرآں مجھ کو

ان کے شاگردوں میں رندؔ و صباؔ کا خاص مرتبہ سمجھا جاتا ہے لیکن انکی یہ خصوصیت بھی صرف اسی رنگ کی بنا پر ہے۔ رندؔ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

بادۂ گلگوں میں افیوں کا اثر ہو جائے گا　　دورِ مے بھی یار بن دورانِ سر ہو جائیگا
خالِ رُخ کے عشق میں مرتے ہیں عاشق سیکڑوں　　سنکھیا کا عام اس حبِّ شفا کا ہو گیا
تلوار دکھاؤ مجھے گولی سے نہ مارو　　تل ڈھانک لو اور ابروِ خمدار دکھاؤ

صباؔ کا مرتبۂ شاعری یہ ہے:۔

سرکشی پر جو وہ سروِ ستم ایجاد آیا　　پاس اڈّے کے گھسٹتا ہوا شمشاد آیا
یارِ گل اندام سے پہلو جو خالی ہو گیا　　سوکھ کر میں شکلِ تصویرِ نہالی ہو گیا

مصحفیؔ چونکہ لکھنؤ کے نہ تھے اس لئے اُن کے سلسلہ سے یہاں

بحث کرنا فضول ہے لیکن اس قدر اظہار ضروری ہے کہ دورِ ناسخ کی لغو و مہمل شاعری سے انحراف کرکے سہل و شستہ زبان میں کچھ کچھ جذبات کو لئے ہوئے غزل کہنے کی بنیاد ڈالنے والے دو ہی شخص تھے ایک ضامن علی جلال جو رشک کے شاگرد تھے اور دوسرے منشی امیر احمد مینائی جو اپنے علم و فضل، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت زیادہ بلند انسان تھے اور جن کو شاعر کہنا میرے نزدیک اُن کی توہین ہے، چونکہ اُسوقت کی فضا میں سوائے شاعری کے کوئی دوسرا نغمہ مقبول ہی نہ تھا اس لئے منشی امیر احمد مینائی پر بھی اس کا اثر ہوا اور شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے ورنہ قدرت نے اُن کو شاید کسی اور اہم کام کے لئے پیدا کیا تھا مگر چونکہ فطرت میں لوچ تھا اور رہرِ کمال کے حصول کا جوہر اُن میں موجود تھا اس لئے اساتذۂ شعر میں اُن کا بھی شمار ہونے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ فخر اُن سے کبھی چھینا نہیں جا سکتا کہ انھوں نے باوجود لکھنؤ میں رہنے کے جہاں ناسخ کی شاعری کے جراثیم ایک مرض متعدی کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور جن سے بچنا دشوار تھا اپنی فطری صلاحیت کی بناء پر وہ ایسے شعر بھی کہہ گئے کہ ہمیں کسی لکھنوی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتے، لیکن

دنیا شاید یہ سُن کر تعجب کرے گی کہ اہل لکھنؤ امیر مینائی سے کچھ خوش نہیں ہیں اور اُن کے مستند استاد ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں۔

امیر مینائی کے دو دیوان مرأۃ الغیب اور صنم خانہ دو علیحدہ رنگ کے دیوان ہیں اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دونوں میں کثیر اشعار اُس رنگ کے ہیں جن پر صحیح تغزل کا اطلاق نہیں ہو سکتا، لیکن ناسخ کی شاعری کو دیکھتے ہوئے امیر کا بُرے سے بُرا شعر بھی ایک درجہ رکھتا ہے اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ذہنیت دہلوی تھی لیکن ماحول کے اثر سے مجبور ہو کر اُنھوں نے لکھنوی شاعری کو اختیار کیا۔

اُن کے چند اشعار جن سے اُن کا صحیح ذوق شعری نمایاں ہوتا ہے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر ۔۔۔ دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا ۔۔۔ امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

کچھ آج نہیں رنگ یہ افسردہ دلی کا ۔۔۔ مدت سے یہی حال ہے یاروں مرے جی کا

لیا پھر تو نے اُس کا نام اے دل ۔۔۔ ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہوں

کرتے ہیں جو لوگ ذکر اُن کا ۔۔۔ ایک ایک کا منھ میں دیکھتا ہوں

دم لے نہ ابھی پوچھ مرے درد کو ہمدم　　روکنے سے جو دل ٹھہرے تو کچھ بات کروں میں

کھاتے ہو قسم نہیں میں عاشق　　صورت تو امیر اپنی دیکھو

اک ذرا پردہ محمل کو اُٹھا دے لیلےٰ　　پھر کوئی حالت بیتابی مجنوں دیکھے

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل　　اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

ہاتھ ڈالا میں نے دامن پر تو بولے ناز سے　　میرا دامن چھوڑئیے اپنا گریباں پھاڑئیے

اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر　　کچھ تمہارا غریب لیتا ہے

کوئی امیر ترا دردِ دل سُنے کیوں کر　　تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی لکھنوی شاعر کے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ تصرف ہے اُن کے اُستاد مصحفی کا جو غیر لکھنوی تھے اور خود اُنکی فطری صلاحیت کا جسمیں دہلویت بڑی حد تک مرکوز تھی۔

امیر اللہ تسلیم بھی لکھنؤ سے نسبت رکھتے ہیں لیکن یہ نسبت ہر لحاظ سے غلط ہے، کیونکہ نہ اُن کا اصلی وطن لکھنؤ تھا اور نہ وہ لکھنوی ذوق کے متبع تھے، چنانچہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی

مجھ کو طرز شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

متاخرین میں مرزا تعشق کا وجود بیشک ایسا ہوا ہے جو خاندان ناسخ کی شاعری میں علیحدہ رنگ رکھتا تھا اور اُن کے مختصر دیوان میں تلاش کرنے سے بعض ایسے شعر مل سکتے ہیں جن کو شعر کہا جا سکتا ہے لیکن چونکہ خالص لکھنوی لوگ تھے اور تلمذ بھی ناسخ سے تھا اس لئے مہملات کی کمی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو :-

سوئے دریا خندہ زن وہ یار جانی پھر گیا — موتیوں کی آبرو پر آج پانی پھر گیا
کیا معاذ اللہ مری وحشت نے پھیلائے ہیں پانوں — راہ برسوں کی مرا چاک گریباں ہو گیا
عشق دنداں کی رعایت مری جان لازم ہے — آبروئے دل بیتاب تواں لازم ہے
کیا کنوئیں مجھ کو جھکائے گی مری کاہیدگی — جاہ میرے واسطے ہر نقش پا ہو جائیگا
کیوں کبوتر کے عوض ہدہد نہ لایا خط شوق — اس خطا پر مجھ سے وہ بلقیس ثانی پھر گیا

ہر چند لکھنوی شاعری کا یہ رنگ برابر انحطاط پذیر ہے اور اب شائد ہی کوئی صحیح مقلد و متبع اس شاعری کا ہو لیکن وہ سمیت جو فضا میں اس طرح پھیل گئی ہو دفعتہً دور بھی نہیں ہو سکتی چنانچہ "زمانۂ قریب" میں بھی بعض خدا کے بندے ایسے گزرے ہیں جو اُستاد ناسخ کی روح خوش کرنے کے لئے کافی سامان اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں ـــــ زیادہ زمانہ

نہیں گزرا جب فرنگی محل کی علم خیز سرزمین سے مولانا حافظ محمد برکت اللہ رضا کا ایک دیوان مطبع یوسفی سے شائع ہوا تھا جسمیں یقیناً وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک "اعجوبۂ ادب" میں ہونا چاہیے۔ مولانا رضا فرنگی محلی یوں تو امیر کے شاگرد تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی روح روز الست ہی میں ناسخ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر چکی تھی ملاحظہ ہو:-

خیالِ سبزۂ خط میں زمرد کا پیا پانی ۔۔۔ تصور میں ترے دانتوں کے ہیرا کوٹ کر پھانکا

مولانا نے یہ شعر نعت میں فرمایا ہے رسول کے سبزۂ خط اور حُسنِ دنداں کا ذکر ان الفاظ میں کرنا حقیقت یہ ہے کہ فرنگی محل ہی کی ذہنیت ہو سکتی ہے۔ مولانا نے ایک بار محبوب کا بوسہ مانگا تھا، اُس کا حال ان الفاظ میں بیان ہوتا ہے:-

بوسہ مانگا گالیاں کھائیں رضا ۔۔۔ زہر پایا ہم نے شکر کا جواب

مولانا کی بوالہوسی ملاحظہ ہو:-

حیرت سے ہم نہ ہوتے جو مبہوت وصل میں
نیند آتی اے رضا انھیں کیونکر تمام رات

دوسرے مصرعہ کو پڑھ کر غور فرمائیے کہ "ان" کے رات بھر نہ سو سکنے کا کیا سبب ہو سکتا تھا اور مولانا کے "تہیۂ پیرافشانی" کی داد دیجئے۔ ایک صاحب نے یہ شعر سُن کر فرمایا کہ ممکن ہے مولانا نے کوئی جائز و حلال صورت پیدا کر کے یہ اشعار کہے ہوں، میں نے کہا اگر مولانا نے یہ شعر کہہ کر اس حُسن ظن کی بھی گنجائش نہیں رکھی ؟

لپٹا یا رضا ہم نے تو جھنجلا کے وہ بولے
اب آپ کے گھر ہم کبھی آیا نہ کریں گے

یہ ہے شاعری ایک عالم متبحر، ایک فقیہہ مستند، ایک محدث جید کی جس کے خاندان میں ہمیشہ سے تورّع و تقدس چلا آرہا ہے اور جس کے اخلاق و سیرت کو لوگ نمونہ و مثال کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ لکھنوی شاعری کے مذموم اثرات کن کن صورتوں سے کن کن طبقوں میں سرایت کر چکے ہیں اور جن کے دور ہونے کے لئے میری رائے میں کم از کم ابھی نصف صدی کی ضرورت ہے۔

الغرض لکھنؤ میں جتنی تغزل کی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابلِ عفو حد تک

عفونت و گندگی سے لبریز ہے۔ یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اُس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہیں یہاں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اُس نے انیس و دبیر کو یہاں پیدا کر دیا، مرثیہ گوئی کم و بیش ہر زبان اور ملک میں پائی جاتی ہے لیکن مذہبی و قومی اہمیت کے لحاظ سے جو مرتبہ لکھنؤ کے مرثیہ گوئی کا ہے اُس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔

لکھنؤ کے موجودہ شعراء کی شاعری کا کیا رنگ ہے۔ اس کے متعلق میرا سرسری فیصلہ یہی ہے کہ فی الحال وہ دہلی اسکول کی ایک ناکام تقلید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور ہنوز وہ علو پیدا نہیں ہوا جو شاعری کو الہام کے حدود سے ملا دیتا ہے۔

موجودہ اکابر لکھنؤ

اس سے قبل میں جب کسی شاعر کا شعر سُنتا تھا تو اپنے تاثر یا شعر کے اثر سے شاعر کی ایک ذہنی تصویر قائم کر لیتا تھا اور جبتک اُس کو دیکھ نہ لیتا۔ اُسی خیالی صورت کے ساتھ ساتھ اُسکے کلام کا

مطالعہ کرتا تھا، لیکن جب بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ ہندوستان کا شاعر اپنے "عالمِ شعر" سے بالکل علیحدہ کچھ اور چیز ہوتا ہے اور اُس کے اقوال سے کبھی اس کے حال و اعمال پر صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، تو میں نے اس اصول پر کاربند ہونا ترک کر دیا اور دوسرا اصول بالکل اسکے خلاف یہ قائم کیا کہ "سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان ہے"۔ ہر چند اس اصول کی بھی صحت پر مجھے وثوق نہیں ہے لیکن یہ اتنا غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر سب سے اچھا شاعر سب سے بُرا انسان نہیں ہوتا تو کچھ ایسا زیادہ دلکش و پسندیدہ چیز بھی نہیں کہ اس اصول کو کلیتہً غلط قرار دیدیا جائے۔

اول اول جب میں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو اُن کے کلام کی رفعت اور جذبات کی بلندی کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے ان کی قائم کی تھی یہ تھی:۔

ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور صحتِ جسمانی کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو بالکل "مترسل الشعر" قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا، ہنستے کم ہوں گے

لیکن باریک جلد کے نیچے ایک خاص قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا، معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی۔ بہ لحاظ اخلاق یکسر عجز و فروتنی ہوں گے، بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک ایسی کشش ہوگی کہ انسان خود بخود اُن کی طرف کھنچ جاتا ہوگا، لباس بالکل مشرقی وضع کا ہوگا اور نمائش سے بالکل دور۔

لیکن جب میں اُن سے ملا تو مجھے کس قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میرے مزعومات کے مطابق نہ تھی، میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے اور اونچا کوٹ۔ ہر چند یہ ضروری نہیں کہ معمولی گفتگو بھی ایک شاعر کی شاعرانہ دلکشی رکھتی ہو، لیکن اس کا تو وہم بھی نہ گزرا تھا کہ وہ قیام کو کیام اور قہقہہ کو کہکہہ بولتے ہوں گے۔

وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ خدایا یہ اقبال دفعتہً اکبال کیسے بن گیا۔ آنکھیں چھوٹی اور بہت چھوٹی، جسم پہلوانی کے لگ بھگ، فربہ تربیت یافتہ، حقہ (ڈھکلہ) کے غیر لطیف و کثیف استعمال کی کثرت سے کمرے کی ساری فضا بدبو سے لبریز، چہرہ کی ساخت، نقشہ کی قطع و برید یکسر غیر دلچسپ اور عوارض میں کوئی دلکشی نہیں۔

اس کے بعد بھی جب میں کسی بڑے شاعر یا بڑے انسان سے ملا تو سوائے ایک ٹیگور کے کہ وہ تو بیشک وہی نظر آیا جیسا میں نے سمجھا تھا باقی سب کو ہمیشہ اپنی ذہنی تصویر سے بالکل مختلف پایا، اور آخر کار میں نے قصد کر کے اپنی ذہنی مصوری کے اصول کو بدل دیا، اور آئندہ کیلئے یہ عہد کر لیا کہ جب کبھی کسی کا شعر سنوں گا تو کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کروں گا کہ اس کا کہنے والا کون ہے اور اگر یہ جاننے کے بعد میں کوئی تصویر قائم کروں گا بھی تو بالکل اپنے تاثرات کے خلاف۔

لکھنؤ آنے سے قبل میں یہاں کے مشہور شعراء کا کلام دیکھ چکا تھا اور اُن کی شکل وصورت، عادات و اخلاق کے متعلق ایک حکم لگا چکا تھا اس لئے میں بیچین تھا کہ کسی طرح ان سے ملوں، اُن کی زبان سے اُن کا کلام سنوں اور پھر اس کے مطابق اپنے "ذہنی مرقع" کی صحت کر لوں۔

یہاں آنے سے پہلے ہی میں ایک خیالی فہرست مرتب کر چکا تھا کہ مجھے کیا کیا دیکھنا ہے اور کس کس سے ملنا ہے۔ چنانچہ میں اپنے ذہن کی رفتار کے لحاظ سے جس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، بغیر رعایت حروف تہجی کے حسب ذیل اسماء کی فہرست تیار کر چکا تھا۔

چھتر منزل، صفی، بٹیروں کی پالی، عزیز، محشر، آرزو، قیصر باغ جالب، رحم علی ہاشمی، ممتاز حسین، عروج، آصف الدولہ کا امام باڑہ، ناطق، احسن، بیلی گارد، ثاقب، نولکشور پریس، آسی، خان بہادر عین الدین سٹی مجسٹریٹ، فرنگی محل کا پُل، کپتان کے کنوئیں کی برفی اور تحسین کی مسجد جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس فہرست میں بعد کو بہت کچھ حذف و اضافہ ہوا۔ لیکن میرے خیال کی جولانگاہ اوّل اوّل یہی تھی جو فہرست بالا سے ظاہر ہوتی ہے۔

صبح اوّل وقت میں اس ارادہ کی تکمیل کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ وہی پارک والے "لقیط"[1] قسم کے دوست آگئے اور انھوں نے حدیقۃ الحیوانات کا ذکر کر کے (جسے یہاں بنارسی باغ کہتے ہیں) میری فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور کر دیا۔ صبح کا وقت تھا، موسم بھی خوشگوار تھا اس لئے اُن کی رہبری میں حضرت گنج کی مغربی معاشرت کی آبادی سے گزرتا ہوا اس وسیع مقام پر پہنچ گیا، جو بیک وقت مرغزار بھی ہے اور صحرا بھی، باغ بھی ہے اور خشک میدان بھی، وحوش و طیور کو

[1] لقیط عربی میں اس بچہ کو کہتے ہیں جو کہیں اتفاق سے پڑا ہوا مل جائے۔

ان کی طبعی حالت پر دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے اور ہر چند انسانی گرفت میں آنے کے بعد ان کی حقیقی وحشت و رمیدگی باقی نہیں رہتی لیکن یہاں بڑی حد تک آزادی کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ شیروں کے لئے بھی تنگ کٹہرے کے بجائے ایک وسیع حصّہ کو آہنی سلاخوں کے حصار سے محفوظ کر دیا گیا ہے جہاں اُن کے لئے نیستان کوہستان اور پانی کے حوض بنا دئے گئے ہیں۔ یہاں کا سب سے زیادہ رومانی حصّہ وہ قطعۂ زمین ہے جہاں یوکلپٹس کے سیدھے اور بلند درختوں کا مختصر سا جنگل تھوڑی دیر کے لئے انسان کو تہذیب و تمدن کے تمام دل و دماغ تھکا دینے والے جذبات سے علیحدہ کر کے ایک ایسی معصوم دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں بغیر کسی معشوق کی موجودگی کے عشق کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب دھوپ تیز ہونے لگی اور واپس آنے کا خیال گیا تو میرے رہبر مجھے سنگ مرمر کی اس خوبصورت وخنک بارہ دری میں لیگئے جہاں کسی وقت یہاں کے امراء بیٹھتے ہوں گے لیکن اب صرف باغ کے مالی رونق افروز رہتے ہیں۔ یہیں اُن کے دو دوست اور مل گئے جو

اتفاق سے میرے یہاں درج رجسٹر تھے اُن کو میں اس وقت تک صرف آسی اور افسر کے نام سے جانتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اُن کا اصلی نام مجھ کو بتایا جائے لیکن آرزو سے تقدیر نہیں پھرتی اور آخرکار ان دونوں کے غیر شاعرانہ نام (عبدالباری اور حامداللہ) مجھے بتا ہی دئے گئے۔ یہ گویا پہلا شگونِ بد تھا جو جانوروں کے مطالعہ سے فارغ ہونیکے بعد ان دو ثقیل اور سامعہ شکن نام رکھنے والے شاعروں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جناب آسی دُہرے بدن کے آدمی ہیں لیکن ادائیں اُن کی سب اِکہری ہیں، اکہری کا لفظ میں نے سادہ اور غیر مصنوعی کے معنی میں استعمال کیا ہے (خندہ[۱] رو، تبسم لب، قہقہہ بپیشانی (ڈھونڈے کا ستارہ بپیشانی ہونا اور بات ہے) انسان ہیں آنکھوں میں شرارت آمیز حیا، چتون میں ہلکی سی متانت ملی ہوئی شوخی، رفتار میں خفیف سی کبک آسا سبکی، اور گفتار میں ہلکی سی شکر میں حلاوت .. سبھی کچھ ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھنے والے پر جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسے ہم صرف خطر و ثیت[۲] سے

---

(۱) اصل میں یہ لفظ خنداں رو ہے لیکن اکثر خندہ رو لکھتے ہیں اور اسی کو سامنے رکھ کر باقی دو لفظ اختراع کئے گئے ہیں۔ (۲) میں نے قصداً عربی کا نہایت ثقیل لفظ استعمال کیا ہے اگر کوئی اس کا مفہوم جاننا چاہتا ہے تو لغت سے مدد لے۔

تعبیر کر سکتے ہیں۔ جو ممکن ہے اُن کی انتہائی سادگی و نیکی کا انعکاس ہو۔ قیافہ فی الجملہ ذہین ہے لیکن نگاہیں دور رس نہیں معلوم ہوتیں۔ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور سولہ سترہ سال سے لکھنؤ میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ باوجودیکہ تقریباً ربع صدی سے لکھنوی شعراء کے ہجوم میں اور لکھنوی شاعری کی محافل میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن اُن کی شاعری کسی طرح یہاں کی آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئی اور اُنکی غزلیں اُن جذبات بلند کی حامل ہوتی ہیں جو یقیناً انکی کاروباری زندگی و مشاغل حیات کو دیکھتے ہوئے حیرت میں ڈال دینے والی ہیں۔ لکھنؤ کے عام رواج کے مطابق یہ بھی غزل گا کر فرماتے ہیں۔ ہر چند اپنے پندار میں وہ بہت زبردست موسیقی پیدا کرتے ہیں، اور آواز میں بھی وہ نزاکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو "دشنام یار" کو بھی "طبع حزیں" پر گراں نہیں گزرنے دیتی لیکن قدرتی محرومی کا کیا علاج کہ نہ مردانہ لب و لہجہ باقی رہتا ہے نہ نسائی غنا پیدا ہوتا ہے اور اس لئے جس حد تک پڑھنے کا تعلق ہے غزل بالکل مخنّث ہو کر رہ جاتی ہے۔ عام شعراء کی طرح انھیں اپنا کلام سُنانے کی ہوس نہیں ہے اسلئے میرے اصرار پر

چند مختلف اشعار انھوں نے سنائے جن میں سے بعض مجھے اب بھی یاد ہیں۔

افسر میرٹھی ایک پستہ قد انسان ہیں اور غالباً فطرت کے مقصود کو شرمندہ کرنے والے نہیں ہیں، ایک قیافہ شناس کے لئے اُن کے چہرے کی ساخت اور اُس کے خطوط میں کافی سامان مطالعہ مل سکتا ہے۔ میں صرف اس قدر سمجھ سکا کہ سرسری ملاقات میں اُن کو سمجھ کر مطمئن ہو جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ اُن کی شگفتہ روئی اگر واقعی عوائد رسمیہ کی بنا پر ہو تو صحرا کے سراب سے زیادہ نہیں۔ لیکن اُن کا وہ خندۂ بے اختیار بھی نہیں چھپتا جب ان کا دل صداقت کے ساتھ اس پر مجبور کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی آنکھیں فریبی قسم کی ہیں یعنی ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رقبہ کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں، البتہ ایک کی ساخت مدوّر ہے اور دوسری کی مستطیل، اور اس طرح گویا اہرمن و یزداں دونوں ہر وقت ان کھڑکیوں سے جھانکتے رہتے ہیں، چونکہ میں ان کی بائیں جانب یعنی اُن کے یزدانی حصۂ دماغ کی طرف تھا اس لئے مجھے اُن کی

اہرمنی دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ آدمی بہت سلجھے ہوئے ہیں اور کافی غور کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کے عادی ہیں، ان کی شاعری بڑی حد تک "شب پرستانہ" قسم کی ہے مگر "شب" "نہیں، آسمان، ستارے کہکشاں، چاند ان کے ذرائع پیام رسانی ہیں اور مقصود شاعری "درس حیات" ——— ٹیڑھی میڑھی بحروں میں ٹوٹے پھوٹے شعر لکھنا ان کا خاص ذوق ہے، جس سے بعض جگہ "انجیلی" کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تغزل میں ان کی جذبات نگاری کے بعض شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

واپسی کے وقت نولکشور پریس میں مرزا محمد عسکری بی۔ اے اور پریم چند کی زیارت ہوئی۔ مرزا صاحب یہاں کے شعبۂ اردو کے مہتمم ہیں اور با وصف ضعف و پیرانہ سالی کے جوانانہ سرگرمی کے ساتھ تحریر و مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کا آخری علمی کارنامہ تاریخ ادب اُردو ہے جو تقریباً آٹھ سو صفحات کو محیط ہے۔ لکھنؤ میں مسلم اکاڈمی کا وجود آپ ہی کی ذات سے قائم ہے کیونکہ نہ آپ ہر ماہ اپنے مکان پر ممبروں کو پُر تکلف دعوت دیں اور نہ کوئی شرکت کے لئے مجبور ہو۔ اکاڈمی میں اس وقت تک بعض اچھے اچھے مضامین پڑھے جا چکے ہیں اور یہ صرف نتیجہ ہے

مرزا صاحب کے شغف علمی کا، مرزا صاحب سُرخ و سپید رنگ، باریک کترے ہوئے نقشہ کے انسان ہیں اور اس حد تک "صنادید عجم" کے آثار آپ میں نمایاں ہیں کہ بے اختیار جی چاہا کہ ایام خزاں میں اُن کے افسانہائے بہار" سنوں، لیکن ہم لوگوں میں جرارتِ اخلاق کا اس قدر فقدان ہے کہ ایام شباب کی معصیت کوشیوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے شرماتے ہیں، حالانکہ جوانی نام ہے اسی "بے راہ روی" کا جو ہر قدم پر نشان لغزش چھوڑ جائے اور اُس "شب روی" کا جو ہر رات کو ایک کہانی بنا جائے۔

پریم چند گورے رنگ کے شریف ہندو ہیں اور ایسی نورانی شکل رکھتے ہیں کہ اگر اُن کی مونچھیں خالص ہندو قسم کی نہ ہوتیں تو میں انھیں مشورہ دیتا کہ وہ "وارثی" بنجائیں اور دین و دنیا دونوں سے "مرفوع القلم" زندگی بسر کریں۔ ہندی شعبہ کا انتظام اُن کے سپرد ہے اور رسالہ مادھوری کی ترقی انھیں کے مساعی کی ممنون ہے۔ پریم چند کی فسانہ نگاری ملک میں کافی شہرت و قبول حاصل کر چکی ہے، لیکن جب سے انھوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا ہے، اُنکی ذہنیت میں کافی تغیر ہوگیا ہے،

چنانچہ "چوگان ہستی" (ہندی ناول کا ترجمہ) دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس تطویل بیجا کو اُردو برداشت نہ کرسکتی تھی وہ ہندی میں کس آسانی سے مقبول ہوگئی اور وہ عصبیت جوان کی اردو فسانہ نگاری میں کبھی ایک افسردہ چنگاری سے زیادہ نمودار نہیں ہوتی تھی وہ ہندی میں کس طرح "شعلۂ ملتہب" بن گئی۔ ہرچند پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں اور اس لئے اردو زبان پر اُن کو وہ قدرت حاصل نہیں ہوسکتی جو سادہ فسانہ نگاری کو چھوڑ کر کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لئے درکار ہوتی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اُنکا سادہ اسلوب ادا کافی دلکش ہے جسمیں پلاٹ کا مقامی رنگ اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے تاہم مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ وہ شخص جو اردو اس قدر صاف لکھنے کا عادی ہو ہندی میں پہنچکر اس قدر ثقیل ہوجاتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ نصاب کی جو اُردو کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوتی ہیں اُن میں بھی سنسکرت کا عنصر غالب کر دیتا ہے۔ اُردو کو عربی فارسی کے مشکل الفاظ سے پاک کرنے کا یہ مدعا تو نہ ہونا چاہیئے کہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ اُن کے بجائے استعمال کئے جانے لگیں۔

یہاں اس وقت تین روزانہ اخبار جاری ہیں، اُن میں سب سے قدیم
ہمدم ہے جو پہلے جناب جالب دہلوی کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا اور اب
چودھری رحم علی ہاشمی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ جالب صاحب کا ہمدم سے
علیحدہ ہونا شعبۂ انتظام کے اختلاف کی بنا پر ہوا، ورنہ جالب صاحب
کی پالیسی کبھی کوئی نہ تھی ـــــــ وہ ہمیشہ اپنے آقا کی مرضی کے مطابق اخبار
چلانے کے عادی رہے ہیں، ہمدم سے علیحدہ ہونے کے بعد اُنھوں نے
اپنا ذاتی اخبار "ہمت" کے نام سے نکالا ہے لیکن چونکہ اس کی پالیسی وہی
ہے جو نہرو رپورٹ کے مخالفین کی ہے اسلئے پبلک میں ......
زیادہ مقبول ہونے کی توقع نہیں کی جاتی۔ جہاں تک فن صحافت کا تعلق
ہے جالب صاحب اپنی وسیع معلومات کی بنا پر اسوقت بےمثل و بےنظیر صحافی
ہیں لیکن چونکہ اُن کا طرز تحریر جوش و شوخی سے معرّا ہے اس لئے ایک
تنگ و محدود حلقہ کے علاوہ اُن کا اخبار اور کہیں مقبول نہیں ہو سکتا۔
جالب صاحب کی ایک خصوصیت اور بھی عجیب و غریب ہے کہ باوجود
عدم ادعائے شاعری کے وہ اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں اور اس
حد تک کہ اگر دفعتہً اُن سے سوال کیا جائے تو شاید بغیر سوچے ہوئے وہ

خود بھی اپنا نام نہیں بتا سکتے۔

ہمدم کے دوسرے ایڈیٹر چودھری رحم علی ہاشمی ایک جوان العمر انسان ہیں، لیکن جوانی کی حرارت سے بالکل خالی، اُن کی سنجیدگی، نیکی، دھیما پن اُس کہولت کا پتہ دیتا ہے جو لکھنؤ میں بچّوں کی شرارت دور کرنے کے لئے افیون کے استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے زمانہ میں ہمدم نے ترقی کی ہے جس کا سب سے بڑا سبب پالیسی کا تغیر ہے۔ ترتیب، حجم، دلچسپی اور طباعت کے لحاظ سے بھی قدیم روش میں کچھ تغیر ہوا ہے لیکن ایسا نہیں کہ دیکھتے ہی کوئی شخص

گھبرا کے یہ کہہ دے کہ لو وہ آئے

ذوقِ جدید و رواجِ حال کے مطابق دو کالم اس میں مزاح کے بھی ہوتے ہیں جو "دو باتوں" کے عنوان سے پہلے صفحہ میں درج ہوتے ہیں۔ "دو دو باتیں" لکھنے والے اک نوجوان شاعر شوکت تھانوی ہیں، جو اس کے شعبۂ ادارات سے وابستہ ہیں۔ یہ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں، آنکھیں بھی سرگیں ہیں اور جسم بھی چھریرا، ۲۰×۲۶ تقطیع کا رکھتے ہیں، صورت سنجیدہ ہے لیکن طبیعت شوخ، دہانہ کی

ساخت سے ظاہر ہے کہ کسی راز کے چھپانے کے اہل نہیں اور اسلئے دل کا معاملہ اُن کے ساتھ کرنا خطرہ سے خالی نہیں، معلوم نہیں اُن سے محبت کرنے والے کیونکر زندہ ہیں۔

تیسرا روزانہ اخبار "حقیقت" ہے اس کے ایڈیٹر اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو غلطی سے ایک صدی قبل پیدا نہ ہو سکے تھے اور اب قدرت اپنی فرو گزاشت کی تلافی اس طرح کر رہی ہے کہ اُن کو زمانۂ حال میں پیدا کر کے ایڈیٹر بنا دیا، سعی و انہماک، صدق و خلوص کیساتھ کسب معاش کرنا اور کسی کی محکومی اختیار نہ کرنا، یہ ہے نصب العین اس اخبار کا۔

ماہانہ رسائل میں صرف "النّاظر" کے ایڈیٹر جناب ظفر الملک سے ملنے کا اتفاق ہوا، یہ بیک وقت لیڈر بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی، مولانا بھی ہیں اور شہر کے قاضی بھی، لیکن دُبلاپن بالکل فطری ودیعت ہے کسی اندیشہ و غم سے اس کا تعلق نہیں، بظاہر بہت متواضع و منکسر معلوم ہوتے ہیں "پس پشت" اور باطن کا حال خدا جانے۔ نگاہ نقد و نظر اسقدر بلند ہے کہ دُنیا میں مشکل ہی سے کوئی چیز انھیں پسند آتی ہے۔ لیکن خود اپنی ذات کو اصول تبصرہ سے مستثنیٰ جانتے ہیں۔ "سچ" بھی انھیں کے اہتمام سے

نکلتا ہے اور عبدالماجد صاحب دریابادی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اُن سے ملنے کا موقع نہیں ملا، مگر سُنا ہے کہ اُن کا دماغ کسی خاص کیفیت سے متاثر ہے اور ملنا بے سود۔ یہیں مولوی صبغۃ اللہ صاحب ایڈیٹر خادم الحرمین سے ملاقات ہوئی۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور شہید تخلص فرماتے ہیں۔ خصائل کے لحاظ سے صبغۃ اللہ کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے، جب کہ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً کی نص قطعی موجود ہے۔

لکھنؤ کے شعراء حال میں صرف چند کا نام خصوصیت کیساتھ مشہور ہے عزیز، صفی، ثاقب۔ جناب عزیز سے ملنے میں بہت دقّت ہوئی کیونکہ آجکل محمود آباد میں قیام رہتا ہے۔ اتفاق سے چند گھنٹے کیلئے لکھنؤ آئے تھے کہ مجھے خبر مل گئی اور میں مکان پر جاکر قدمبوس ہوا۔ میں نے انھیں بھی ایک نحیف الجثہ انسان سمجھ رکھا تھا لیکن یہ بھی "ماشاءاللہ" نکلے۔ چہرہ کے گوشت نے خدوخال چشم و بینی کا بدنمائی کی حد تک احاطہ کر رکھا ہے اور نقشہ کی ذہانت معدوم ہوگئی ہے۔ چہرہ کی خشونت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی خلش ہر وقت ایذا دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ گفتگو میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ کوئی عمق و ذہانت

لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن کا دماغ شاعرانہ ہے، شعر اچھا کہتے ہیں اور تمام اصنافِ سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ مضمون کی جستجو الفاظ کی تلاش، ترکیب کی چستی، خیال کی حلاوت اور جذبات کی اثر انگیزی اُنکے کلام کی خصوصیات ہیں، شاگردوں کی بڑی جماعت رکھتے ہیں جنمیں سے رواںؔ اور اثرؔ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو خود اپنی اپنی جگہ اُستادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

صفیؔ معمر شخص ہیں اور غیر شاعرانہ حد تک زار و نحیف۔ حالانکہ میں نے اُن کی شاعری سے اُن کے "عظیم الجثہ" ہونے پر حکم لگایا تھا نہ طبیعت میں شگفتگی، نہ چہرہ پر رونق، نہ اداؤں میں وابستگی، نہ گفتگو میں جاذبیت، الغرض دنیاوی انسان ہونے کے لحاظ سے وہ صفر کا درجہ رکھتے ہیں اور ایک ایسی غیر جمالیاتی فضا اُن کے چاروں طرف محسوس ہوتی ہے کہ اگر قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ نہ دیدیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص اُن سے ملتا۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر سُنا ہے کہ آدمی نیک ہیں اور اخلاق و اطوار بھی غیر پسندیدہ نہیں رکھتے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے اُن کو مرتبۂ اُستادی حاصل ہے اور لکھنؤ کے جدید دور کے شعراء میں وہ خاص

عزت رکھتے ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اُن کے کلام کی سادگی شگفتگی، یقیناً قابل ستائش ہے۔ لیکن انھوں نے قومی شاعر بننے کی کوشش میں اس خصوصیت کو ایک حد تک مجروح کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ اُن کے قومیاتِ شعری کسی طبقہ میں کچھ چیز سمجھے جاتے ہوں لیکن میں اُن کو اس جوش سے بالکل معرّا پاتا ہوں جو قومی نظموں کو غزلوں سے متمایز کر دیتا ہے۔ ان کی بڑی معرکۃ الآرا قومی نظم "وقت آنے دو وقت آنے دو" والی ہے، لیکن اس میں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس کے اندر شعلہ تو کیا کوئی چنگاری ہی راکھ میں دبی ہوئی مل جائے مثنوی کہنے کا بیشک اُنھیں خاص سلیقہ حاصل ہے اور اسی میں ترقی کرنا اُن کی کامیابی ہے اگر وہ سمجھیں۔

اب محشرؔ کا وہ ہنگامہ نہیں ہے جو پہلے کسی وقت تھا لیکن بعض بعض شعرا اب بھی کہہ جاتے ہیں اور سُنا ہے کہ آدمی بُرے نہیں۔ مجھ سے صرف ایکبار چوک میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہاں کے کوئی عطر فروش ہوں گے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جناب محشرؔ آپ ہی ہیں، خود اُن کی زبان سے اُن کے کلام سُننے کا فخر مجھے حاصل

نہیں ہوا اور نہ اس کے لئے میں بیتاب تھا۔

جناب ثاقب آجکل مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعض صاحبزادگان کے اتالیق ہیں اور اپنے خدمات کے انہماک کی وجہ سے شعروشاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکتے۔ آدمی بہت نیک، خوش اخلاق، متواضع ومنکسر مزاج معلوم ہوتے ہیں اور چہرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام شعراء کی طرح اُن کا باطن ناقابل ذکر نہیں ہے، اُن کے شعروں کی خصوصیت یہی ہے کہ ابتذال کہیں نہیں ہوتا اور خیال بھی عام سطح سے بلند ہو کر اچھوتی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عروج جو یہاں دولھا صاحب کے نام سے مشہور ہیں انیس کی باقیات الصالحات میں سے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں، ہر چند ضعیفی سے کمر جھک گئی ہے اور تمام وہ علاماتِ شیب جو انسان کو آدمی سے خدا جانے کیا بنا دیتے ہیں اُن میں پوری طرح نمایاں ہیں لیکن جب وہ ممبر پر پہونچتے ہیں تو دفعۃً ایسا تغیر اُن میں پیدا ہو جاتا ہے جیسے کوئی اچانک نشہ سے چونک پڑے اور خطابت کے تمام حرکات پوری قوت کیساتھ رونما ہونے لگتے ہیں۔

جناب احسن لکھنوی جو اپنی ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے شہرت رکھتے ہیں غزل گوئی کے لحاظ سے کوئی مرتبہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بہ حیثیت انسان ہونے کے وہ دلچسپ چیز ہیں۔ طبیعت بہت غیور پائی ہے اور سب سے الگ بے لاگ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ باوجود عمر رسیدہ ہونے کے اب بھی اُن کی جوانی کا بانکپن اُن کے اعضا سے ظاہر ہے اور مخصوص حلقۂ احباب میں اب بھی اُن کی شگفتگی وزندہ دلی دیکھنے کی چیز ہے، موسیقی سے خاص لگاؤ ہے اور ہارمونیم اچھا بجاتے ہیں، انھوں نے اپنی زندگی جس لطف سے بسر کی ہے، وہ شاذ ہی یہاں کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو اور اب بھی جس نفاست و پاکیزگی اور جس سلیقہ کے ساتھ وہ رہتے ہیں اُس کا نشان بھی دوسرے شاعروں میں نہیں پایا جاتا۔

یہاں کے شیعی طبقہ کے صحافیوں میں صرف ایک سید ممتاز حسین صاحب عثمانی ایڈیٹر "اودھ پنچ" قابل ذکر ہیں، ہر چند موجودہ اودھ پنچ کا موازنہ سجاد حسین کے "اودھ پنچ" سے کرنا نامناسب سی بات ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں سوائے ممتاز حسین صاحب کے

اور وہ پنچ کی روایات قدیمہ کی یاد کو تازہ رکھنے والا کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔ آدمی پڑھے لکھے ہیں، وسیع المطالعہ ہیں، اور ہر چند اُن کی وضع وصورت اور گفتگو سے کبھی کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ پنچانہ رنگ کے انسان ہوں گے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ایسے ہی ہیں اور بعض اوقات ان کا قلم ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان واقعات کو بیان کرنا پسند نہیں کرتا جوانکی عصبیت کے ثبوت میں مجھ سے بیان کئے گئے ہیں، کیونکہ اگر وہ صحیح ہوں تو بھی جہانتک پنچ اور پنچپن (کولُ صاحب اسے کچھ اور نہ پڑھ لیں) کا تعلق ہے اُن کی تعریف ہی کی جائے گی۔

میں ان سے ملنے کے بعد جائے قیام پر واپس آیا ہی تھا کہ میرے ایک دوست کا تار آیا جسمیں انھوں نے مجھے ایک ضروری مسئلہ طے کرنے کیلئے ڈیرہ دون طلب کیا تھا، اسلئے میں بغیر تکمیل پروگرام لکھنو چھوڑ رہا ہوں اگر زندگی رہی تو پھر کسی وقت حاضر ہونگا، لیکن محرم کا زمانہ بچا گئے، تاہم ڈیرہ دون پہنچکر مجھے یہاں کے اس مشاعرہ کا ذکر ضرور کرنا ہے جسمیں شرکت کا فخر تو مجھے حاصل ہوا تھا، لیکن جس کا حال میں خود قلمبند نہیں کر سکا۔

سیّاح کی ڈائری کا تتمّہ

لکھنؤ کا ایک مشاعرہ

(سیّاح کے نمائندہ کے قلم سے)

لوکل سُسرال کو اسی لئے تو ہم بُرا کہتے ہیں کہ کسی بات کا کوئی ٹُھک ہی نہیں، جب اُن کا جی چاہا ڈولی منگا چل دیں اور لطف یہ ہے کہ وہاں جاکر اس اطمینان سے قیام فرماتی ہیں گویا "بیرونجات" تشریف لے گئی ہیں۔ حالانکہ چوک سے امین آباد کچھ دور نہیں یعنی دونوں ایک ہی لکھنؤ کے محلّے ہیں جن کے درمیان بیشمار یکّے دن رات چلا کرتے ہیں مگر یہ ہمارا اصول ہے کہ ہم ذرا سُسرال جاتے ہوئے شرماتے ہیں، اور اس کا احساس خود اُن کو بھی ہے لہذا وہ تشریف لیجانے کے بعد دوسرے تیسرے اپنی خیریت کا دستی خط بھیجتی رہتی ہیں لیکن اس میں بھی لوکل ہونے کی وجہ سے بے تکا پن شامل حال رہتا ہے کوئی ٹھیک

نہیں خدا جانے کس وقت خط آجائے، آج صبح سے انتظار کرتے رہے مگر خط غائب، آخر ذرا کھڑے کھڑے ایک صاحب کی عیادت کیلئے چلے گئے وہاں اتفاق سے ہو گیا تھا اُن کا انتقال لہذا قبرستان تک جانا پڑا، واپسی میں لیٹر بکس سے منجملہ اور خطوط کے اُن کا خط بھی نکلا۔ اُن کے خط کی خاص پہچان یہ ہے کہ اُس پر لوکل اور دستی ہونے کی وجہ سے مہر نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ ٹکٹ بھی نہیں لگاتیں، یہ پہچان ایسی ہے کہ ہزار دو ہزار خطوط میں اُن کا خط پہچانا جا سکتا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے اُن ہی کا خط کھولا مگر وہ اُن کا نہ تھا بلکہ خط ہی نہ تھا کچھ اور تھا اس کی عبارت مطبوعہ تھی اور کچھ قلمی، اس سے پہلے اس قسم کا کوئی خط ہم نے نہیں دیکھا تھا، اب کھول ہی چکے تھے لہذا لگے ہاتھ پڑھ بھی ڈالا، لکھا تھا:۔

بزم مشاعرہ

۱۵۔ نومبر ۱۹۲۹ء کو بوقت شب بمقام منصور نگر بر مکان چھمّن صاحب سوز خواں بزم مشاعرہ منعقد ہوگی، ارباب ادب اور شعراء گرامی سے استدعا ہے کہ اپنی شرکت سے بزم سخن کو سرفراز فرمائیں۔

نوٹ :۔ (۱) پابندیٔ وقت کا لحاظ لازمی ہے (۲) غیر مدعو حضرات نہایت اعزاز سے صفِ سامعین میں جگہ پاویں گے۔ (۳) گیارہ اشعار سے زیادہ پڑھنے کی زحمت نہ دی جائے گی

مصرع طرح :۔ منھ پھیر لیا ناز سے شرما کے کسی نے

قافیہ :۔ شرما کے، کھا کے۔ ردیف :۔ کسی نے

الملتمس :۔ سید تقی مرزا رُخسار لکھنوی

یعنی یہ مشاعرہ کارڈ تھا، مشاعرہ کے متعلق ہمارے ایک دوست نے ایسے ایسے قصّے سُنائے تھے کہ ہم کو خود مشاعرہ میں جانے کا بہت شوق تھا، ایک مرتبہ کا قصہ انھوں نے بیان کیا تھا کہ کسی شاعر نے ایک مصرعہ پڑھا کہ :۔ "ناریل جس کے لگا ہاتھ وہ بندر" ـــــــ ابھی وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ تمام حاضرین چیخ اُٹھے "میں ہوں" "میں ہوں"۔ ہم کو یہ قصہ سُن کر بڑی ہنسی آئی اور اُسی وقت سے میرا ارادہ تھا کہ ابکی کہیں مشاعرہ ہو اور میں پہونچوں کاش کہ ہم اس کارڈ کے آنے سے پہلے ہی کسی مشاعرہ میں چلے گئے ہوتے تاکہ "غیر مدعو" ہونے کی صورت میں نہایت اعزاز سے صفِ سامعین

میں جگہ تو پاتے اور اب یہ پس وپیش تھا کہ مدعو ہونے کی صورت میں خدا جانے کیا حشر ہو، بہرحال اول تو شوق اتنا تھا کہ اعزاز و تذلیل کا امتیاز باقی نہ رہا دوسرے یہ کہ رات اپنی تھی لہٰذا ارادہ کرلیا کہ جائینگے اور ضرور جائیں گے۔ تمام دن مشاعرہ جانے کی تیاری میں گزرا، بال بنوائے، صابن سے نہائے، جوتے پر پالش کرائی، نئے کپڑے اور نکاح والی شیروانی نکالی، ٹوپی پر برش کیا، موزے کی پھولدار جوڑی خرید لائے اور بکس میں سے ایک ریشمی رومال نکالا، ڈبیا میں الائچی ڈال کر پان بنوائے اور ٹھیک سات بجے بن سنور کے چھڑی ہلاتے گھر سے اس طرح نکلے کہ ع

شورہ ہر سمت ہوا یار چلا یار چلا

منصور نگر میں جھمّن صاحب سوز خواں کے مکان پر ایک مرتبہ محرم میں آنے کا اتفاق ہوا تھا لہٰذا مکان کی جستجو ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھی اور ہم سیدھے چوک ہوتے ہوئے مگر نظریں نیچی کئے منصور نگر پہنچ گئے جہاں گیس کی روشنی جھمّن صاحب کے مکان کے بڑے پھاٹک پر لگی ہوئی تھی اور سب لوگ آ آ کر پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے۔

ہم بھی اپنے مدعو ہونے کی صورت میں تذلیل کے خوف سے ڈرتے ڈرتے آنکھ بچا کر چپکے سے اندر چلے ہی گئے جہاں ایک وسیع صحن میں کنارہ کی نالیوں کو چھوڑ کر دریاں، دریوں پر چاندنیاں اور اُن پر رنگ برنگ کے قالین بچھائے گئے تھے، ایک کونہ میں ایک شمعدان بھی رکھا تھا اور تھوڑی دور کے فاصلہ پر اُگالدان بھی رکھے ہوئے تھے، حاضرین کا مجمع کافی تھا یعنی ایسا کہ ہم سب کے پیچھے نہایت آسانی سے چھپ سکتے تھے، اس مجمع میں نوجوان، جوان، ادھیڑ اور بوڑھے سب ہی قسم کے لوگ تھے مگر ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ عمر کے لحاظ سے سب علیٰحدہ علیٰحدہ بیٹھے تھے جوان سب مل کر ایک طرف تھے اور بوڑھے بوڑھے لوگ ایک جگہ جمع تھے لیکن نشست کچھ اس طرح تھی کہ وسط میں ایک وسیع دائرہ چھوڑ کر چاروں طرف حلقہ بنا کر لوگ بیٹھے تھے۔

یہ تھا وہ منظر جو مکان میں داخل ہوتے ہی نظر سے گزرا۔ ہماری طرح اور لوگ بھی تازہ وارد تھے مگر اُن کو قالینوں پر جگہ مل رہی تھی اور نہایت اعزاز کے ساتھ شائد وہ غیر مدعو ہوں گے لیکن ہم نے کسی کو

اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ ہمارے مدعو ہونے کا راز معلوم کریں۔ ہم چپکے سے جوتے لئے ہوئے سب سے پچھلی قطار میں چلے گئے اور ایک جگہ خاموش بیٹھ رہے۔ اپنے بیٹھ جانے کی طرف سے اطمینان کر کے ہم پھر مجمع کی طرف متوجہ ہوئے۔ لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور آنے والے آ کر بیٹھتے جاتے تھے لیکن ہر نئے آنے والے کے ساتھ ایک "بسم اللہ" کا طوفان آتا تھا، کچھ لوگ صرف منہ سے بسم اللہ کہہ دیتے تھے کچھ تھوڑا اُٹھ کر منہ سے بسم اللہ اور ہاتھ کی جنبش سے تسلیم کہتے اور کچھ نصف کے قریب اُٹھ کر یہی حرکت کرتے تھے اور آنے والا "آداب بجا لاتا ہوں، تسلیمات عرض کرتا ہوں" کہتا ہوا ایک جگہ بیٹھ جاتا تھا، اس کے بیٹھنے کے بعد کسی طرف سے "آداب عرض حضور" کسی طرف سے "حضور کا مزاج" کسی طرف سے "آج تو عرصہ کے بعد زحمت فرمائی" کسی طرف سے "نصیب دشمناں کچھ طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے" کی قسم کی آوازیں آنا شروع ہوئیں اور اس کے جواب میں "جی ہاں نزلہ بخار پریشان کئے ہوئے ہے" کہا جاتا تھا، اسی طوفان آداب و تسلیمات میں ایک آواز آئی کہ اب تو وقت آ گیا" دوسری آواز "جی ہاں شروع

ہونا چاہیئے" تیسری آواز "بسم اللہ" اور اس کے بعد ایک صاحب نے "عرض کرتا ہوں" کہہ کر ممتاز بیگم کی طرح اُس ترنّم سے جس کو فن موسیقی سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن ہارمونیم پر فٹ بیٹھے یہ مصرعہ فرمایا ع

آج منہدی پس رہی ہے قتل کی تدبیر ہے

تمام لوگوں نے اپنی اپنی آواز میں اس مصرع کو پڑھا اس کے بعد پڑھنے والے نے دوسرا مصرع ذرا لمبی تان سے پڑھا اور وہ ابھی "ہے "بھی نہ کہنے پایا تھا کہ" واہ وا، واہ، کیا مزے کا شعر نکالا ہے، بھئی واہ ذرا پھر پڑھنا، جیتے رہو دل خوش کر دیا" وغیرہ کے فلک شگاف نعروں سے میں تو ایک دم سے اُچھل پڑا اور وہ حضرت ہیں کہ ہنس ہنس کر ادھر منہ کر کے اُدھر منہ کر کے اُٹھ کر بیٹھ کر سلام کر رہے ہیں، ہاتھ جوڑ رہے ہیں اور شور ہے کہ کسی طرح کم ہی نہیں ہوتا آخر پھر اُنھوں نے وہی شعر پڑھا لیکن اب کی صرف کیا کہنا، سبحان اللہ، سبحان اللہ" پر تعریف ختم کر دی گئی، اور وہ سلام کر کے دوسرا شعر پڑھنے لگے اور ہر شعر پر یہی طوفان آیا کیا یہاں تک کہ اُن کی غزل ختم ہوگئی اور انھوں نے کھڑے ہو کر سب کو سلام کیا اور لوگوں نے

"کیا خوب غزل فرمائی ہے ہر شعر لاجواب تھا" کہہ کر اُن کے سلام کا جواب دیا انھوں نے بیٹھ کر اس تنہا شمعدان کو جس کا مصرف ابھی تک ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب کی طرف بڑھا دیا اور اُنھوں نے دوزانو بیٹھ کر جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور "عرض کرتا ہوں" کہہ کر مجمع کو اپنی طرف متوجہ کیا، یہ صاحب ذرا شرمیلے معلوم ہوتے تھے لہذا انھوں نے گردن جھکا کر مولوی محمد اسمٰعیل کی تیسری ریڈر کی طرح بالکل رواں یہ مصرع پڑھا۔ ع

انگڑائی جو لی ناز سے شرما کے کسی نے

اس مصرعہ کو بھی حاضرین نے پڑھا جب دوسرا مصرعہ پڑھا گیا تو ختم ہونے سے پہلے ایسا شور ہوا کہ ہم کچھ سمجھ ہی نہ سکے بس تیر، جگر، نظر، سمجھ میں آیا اور باقی مصرعہ کو "اہا ہا۔ ارے ظالم پڑھے جاؤ۔ کیا ثبوت ہے کیا بات پیدا کی ہے۔ کس رُخ سے مصرعہ لگایا ہے مدح نہیں ہو سکتی۔ تعریف سے مستغنی ہے۔ پھر فرمائیے مکرر۔ واہ وا۔ واہ۔ اے سبحان اللہ ہے ہے" کے شور نے ہمارے کانوں تک نہ پہنچنے دیا اور اسی طرح اس بیچارے کے باقی شعر بھی یاروں نے خود ہی سُنے اور خود ہی تعریف کی

ہم تو تعریف کرنے والوں کا منھ دیکھا کئے کوئی تو ناک چڑھا کر منھ کھول ہاتھ بڑھا کر "واہ" کہتا تھا، کوئی زانو پر ہاتھ مار کر دونوں شانے ہلا کر دانت پیس کر "ارے توبہ" کہتا تھا، کوئی صرف ذرا سا ہنسکر اور سخن فہمانہ گردن ہلا کر "کیا کہنا ہے" کہتا تھا، کوئی صرف ہاتھ بڑھا کر استادانہ شان سے "بھائی پھر پڑھو" کہہ کر دوبارہ پڑھواتا تھا اور پڑھنے والا پڑھتا الگ تھا سلام الگ کرتا تھا لیکن اس دوگونہ عذاب پر بھی خوش تھا، ان حضرت کے پڑھ چکنے کے بعد دو ایک آدمیوں نے اور پڑھا اور ہر ایک پڑھنے والے کے ساتھ وہی شور و غل ہوتا رہا اگر کبھی خاموشی طاری ہو جاتی تو لوگ تقاضا شروع کر دیتے تھے کہ "مصرعہ اُٹھائیے صاحب آپ کی طرف مصرعہ نہیں اُٹھ رہا ہے" اور پھر وہی ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا، چھ یا سات صاحبان پڑھ چکے تو ایک صاحب نے پان لانے کے واسطے اپنی اصطلاح میں فرمایا کہ "پان کا دور ہو جائے" یہ کہتے ہی ایک صاحب کشتی میں پان اور اُسی میں تمباکو لئے ہوئے تشریف لائے۔ پان کا دور ایک قسم کا "انٹرول" ہوتا ہے جسمیں لوگ پیشاب کو بھی اُٹھ جاتے ہیں کچھ پانی طلب کرتے ہیں اور دس پندرہ

منٹ کے بعد پھر مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ اس پان کے دور کے بعد چار پانچ آدمیوں نے پڑھا جن میں ایک صاحب سب سے اچھا گاتے تھے اور آواز بھی پاٹ دار تھی، اسی لئے اُن ہی کی تعریف زیادہ ہوئی۔ ان صاحب کے بعد سن رسیدہ پڑھنے والے رہ گئے تھے جن کے متعلق لوگوں کی بات چیت سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ اُن کا شمار اساتذہ میں ہے۔ سب سے پہلے پڑھنے والے تقریباً پچاس سال کی عمر کے ہوں گے، ڈاڑھی تو تھی نہیں مگر مونچھوں میں خضاب لگا ہوا تھا جب اُن کا نمبر آیا تو انھوں نے دوزانو بیٹھ کر جیب سے پہلے عینک نکالی، پھر ایک کاغذ، عینک لگا کر مجمع کو بغور دیکھا اور ایک صاحب سے متوجہ ہو کر فرمانے لگے "آج ہی مصرعہ ملا، اس قابل تو نہیں کہ پڑھی جائے مگر خیر عرض کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے گا"۔ پھر دوسرے صاحب سے کہا "حضور اجازت ہے"؟ پھر تیسرے سے فرمایا "شاید کسی قابل ہو ایک نئی بات کہی ہے، صاف سا مطلع ہے زبان ملاحظہ فرمائیے"۔ میں سمجھا کہ اب زبان نکال کر دکھائیں گے مگر اُنھوں نے عجیب بھیانک آواز سے کچھ اس طرح شعر پڑھا کہ باوجود شور نہ ہونے کے کوئی لفظ ہماری سمجھ میں نہ آیا، لیکن

معلوم نہیں دوسرے لوگوں نے کس طرح اُس کو سمجھ لیا ــــــــ پڑھنے والے صاحب نے واہ واہ طلب نگاہوں سے مجمع کو دیکھ دیکھ کر سلام کرنا شروع کردیئے آخر "حضور پھر فرمائیے، کس تیور سے مصرع لگایا ہے۔ یہ قافیہ آپ کا ہوگیا، حضور ایک مرتبہ زحمت فرمائیے، واللہ سیری نہیں ہوتی" کے تقاضوں سے انھوں نے پھر وہی پڑھا لیکن اُسی نہ سمجھ میں آنے والے انداز سے اور پھر وہی 'واہ واہ' کے نعرے بلند ہوئے۔

اس کے بعد دوسرا شعر پڑھنے کے لئے اُن حضرت نے دوسرا پہلو بدلا، اچکن کا دامن سنبھالا، مونچھوں پر تاؤ دیا، کھنکھارے اور اُنگلی اُٹھا کر ایک صاحب سے فرمایا:۔

"اس کی داد لے لوں گا، شائد نئی بندش ہو، سامنے کا مضمون ہے ملاحظہ فرمائیے"۔

یہ کہہ کر جو شعر پڑھا تو پہلی مرتبہ سے زیادہ طوفان آیا لیکن ہم ان حضرت سے ایسے تنگ آگئے تھے کہ دعا کر رہے تھے خدا کرے کہیں جلد ان کی غزل ختم ہو اور کوئی دوسرے صاحب پڑھیں لیکن ہم کو کیا معلوم تھا کہ دوسرے صاحب ان سے بھی زیادہ سبحان اللہ ہوں گے۔

ان حضرت کے عجیب ٹھاٹھ تھے، عجیب بوکھلائی ہوئی صورت بنائے بیٹھے تھے، اپنا نمبر آتے ہی بلا پس و پیش غزل نکالی اور پڑھنا شروع کیا، عجیب طرح پڑھتے تھے۔ ہم نے تو یہی سُنا ع

"دل تھا مولی یا۔ ہارے تیر نظر کھا کے۔ یا ہی یا ہی"

اور اُس کے بعد بڑھے ہوئے ہاتھ بڑھے رہے، کُھلا ہوا منھ کھلا رہا ہاں ذرا چہرے کے رنگ میں سُرخی اور پیشانی پر شکنیں زیادہ بڑھ گئی تھیں تمام مجمع تعریف کرتا رہا مگر وہ اپنے اسی انداز سے دیر تک بیٹھے رہے آخر جب لوگوں نے "مکرّر ارشاد" کہہ کر انھیں ہوشیار کیا تو انھوں نے پھر اسی انداز سے پڑھنا شروع کیا اور پوری غزل میرے شیر نے اسی طرح پڑھ ڈالی، ان کے اس پڑھنے پر ہمارے علاوہ بہت سے لوگ ہنس رہے تھے مگر کیا کسی کے ہنسنے سے مشاعرہ میں جانا چھوڑ دیتے، ہنسنے والے ہنسا کئے، اپنے منھ سے ہنسے، انھوں نے تو اپنی غزل پڑھ لی، ان میں ایک بات بڑی لاجواب تھی کہ پڑھنے کے وقت کوئی لاکھ ہنسے لاکھ بنائے مگر اُن کو اپنے پڑھنے سے کام رہتا تھا اور کوئی ہوتا تو بُرا مان جاتا۔ اوّل تو وہ خود اٹک اٹک کر پڑھتے تھے

دوسرے لوگ "مکرر ارشاد" کا جھگڑا لگا دیتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹہ کے قریب اُن کے کلام سے لطف اٹھانے کا موقع ملا اُن کا پڑھنا اس حیثیت سے بھی بھاگوان ثابت ہوا کہ مشاعرہ کا بڑا "انٹرول" یعنی چائے کا دور شروع ہو گیا۔ یہ وقفہ اتنا طویل تھا کہ اگر ہم کو پہلے سے معلوم ہوتا تو شائد ایک نیند سو بھی لیتے، لیکن قسمت میں تو ایک لب بند لب سوز اور لبڈڑ چائے کی پیالی مع ایک عدد شیرمال کے بوقت دو بجے شب لکھی ہوئی تھی۔ سوتے کیسے؟ ہم کو بھی اور لوگوں کی دیکھا دیکھی اور عذر کرنے والوں کی طرح آخر چائے پینی ہی پڑی بلکہ شیرمال بھی کھانا پڑی اور اس شغل میں وقت بڑے مزے سے کٹ گیا یعنی ہماری چائے کی پیالی کے ساتھ "انٹرول" بھی ختم ہو گیا، ابھی ہم آخری گھونٹ پینے کے لئے کچھ پیالی کو اوپر لانے اور کچھ گردن کو نیچے جھکانے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ "ہاں ارشاد" کی آواز نے ہماری نظروں کو شمعدان کی تلاش میں مصروف کر دیا اسلئے کہ یہی پڑھنے والے کی نشانی ہم نے مقرر کی تھی کہ جس کے آگے وہ شمعدان ہوگا وہی شخص پڑھے گا۔ اس مرتبہ شمعدان جن صاحب کے سامنے رکھا تھا انکی

شکل، صورت، انداز نشست و لباس غرض کہ ہر بات سے معلوم ہوتا تھا کہ ان حضرت کو دیکھنے کے بعد اُردو زبان کی لغات میں ایک لفظ "تصنع" کی ضرورت پیش آئی ہو گی جس کے معنی وہ حضرت خود تھے جواب پڑھنے والے تھے سر پر بیل دار چُنی ہوئی دو پلّی ٹوپی اس انداز سے ترچھی کر کے پہنی گئی تھی کہ بالوں کے دو بڑی محنت سے بنائے ہوئے چھلّے ٹوپی کے باہر اور ابرو کے اوپر پیشانی کو چھپاتے رہیں آنکھوں پر ذرا رنگین شیشوں کی گول عینک لگائی گئی تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ مجھ کو شوقیہ لگایا گیا ہے، لباس میں نہایت عمدہ سِلا ہوا انگرکھا اور اُس کے نیچے گلابی رنگ کا اتنا باریک کرتہ پہنا گیا تھا کہ جالی دار بنیائن صاف نظر آ رہی تھی پیروں میں جالی کھلا ہوا پاجامہ اور اس پر ریشمی موزے تھے ایک ہاتھ میں غزل اور دوسرے میں نارنجی رنگ کا ریشمی رومال تھا، غرضکہ وہ سر سے پاؤں تک دیوان غالب مرقع چغتائی معلوم ہوتے تھے اپنا نمبر آنے پر پہلے لباس کی شکنیں درست کیں پھر کلائی کی گھڑی پر سے انگرکھے کی آستین کو ہٹایا اور نہایت دلکش انداز سے فرمایا "اجازت ہے" جواب میں ہر طرف سے "بسم اللہ ارشاد" کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں

یہاں تک کہ آپ نے سب سے جداگانہ طرز میں ذرا ترچھے ہو کر دھیمے سُروں میں آواز کو دانستہ باریک بنا کر اور اپنے خد و خال سے گویا اثر لینے کا انداز پیدا کر کے کچھ فرمایا اور اُن کے خاموش ہوتے ہی تمام حاضرین نے یکزبان ہو کر نثر میں یعنی بغیر ترنّم اُنکا مصرعہ دُہرایا جب وہ دُہرا چکے تو پھر اُن حضرت نے دوسرا مصرعہ پڑھا جس کے پڑھتے ہی قیامت آ گئی، چیخ پکار پڑ گئی، ایسا غل مچایا کہ سڑک پر کتّوں نے بھونکنا شروع کر دیا اور اُن کی تمام غزل اسی کیفیت میں تمام ہوئی، اُن کے بعد جو صاحب تشریف فرما تھے اُن کے متعلق شروع سے ابتک ہم بھی غور کر رہے تھے کہ آخر اس سن مبارک میں ان بزرگوار نے یہ زحمت کیوں فرمائی ہے یعنی یقین جانیئے شدت ضعیفی سے پلکیں تک سفید ہو گئی تھیں اور چہرہ پر اتنی جُھرّیاں تھیں کہ اچھا خاصہ بیمار خانہ بن گیا تھا موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائے ایک چادر لپیٹے اس طرح بیٹھے تھے گویا کسی نے لکڑی کے سہارے اُن کو بٹھا دیا ہے مگر جناب وہ بڈھا تو بڑا زوردار نکلا حالانکہ آواز مشکل سے نکلتی تھی لیکن ترنّم تو ایسا لاجواب تھا کہ جمنا سنگ کے کرتب بھی مات تھے، گلے کی رگیں پھول

جاتی تھیں اور ہر لفظ پر معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اب دم نکلا مگر وہ مرجھائی اور سمٹی ہوئی کھال کے دُبلے دُبلے ہاتھوں کی جنبش سے زمین آسمان ایک کئے دیتا تھا اور لوگ اُس کی اس محنت کی دل کھول کر داد دے رہے تھے جن میں ایک صاحب نے تو بالکل انکار ہی کر دیا کہ "میں نے کچھ نہیں کہا ہے" لیکن لوگ اُن کے پیچھے پڑ گئے اور وہ بیچارے قسمیں کھانے لگے کہ :-

"آپ کے سر عزیز کی قسم ایک شعر بھی نہیں کہا ہے اور جو ہے وہ سنانے کے قابل نہیں، بھلا ایسی ایسی غزلوں کے بعد میں کیا پڑھوں"۔

لیکن کسی کو ان کی قسم کا اعتبار نہ ہوا اور سب پیچھے پڑ گئے تو اُن نہ کہنے والے نے ماشاء اللہ سب سے زیادہ کہا لیکن ایک دم سے نہیں ایک ایک دو دو شعر کر کے، اب سب کے آخر میں پڑھنے والے نے بھی ناسازی طبع، ہمشیرہ کی علالت، لڑکی کے عقد، والدہ کی ناگہانی موت اور سب سے زیادہ قلت وقت کا رونا رو کر معذرت چاہی مگر وہاں سب کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب کچھ کہا نہیں ہے تو کیوں تشریف لانے کی زحمت فرمائی؟ اور یہ سوال شک میں

ڈال دیتا تھا کہ انھوں نے ضرور غزل کہی ہو گی اصرار چاہتے ہیں لہٰذا اصرار شروع ہوا اور یہاں تک ہوا کہ بیچارے کو کہنا پڑا کہ اے حضرت بھلا آپ سے زیادہ شعر تھوڑی پیارے ہیں مگر واللہ باللہ دو شعر اور ایک مصرعہ سے زیادہ کچھ کہا نہیں ہے اب وہ کیا پڑھوں" لیکن جب لوگوں نے اُن ڈھائی شعروں کے پڑھنے پر زور دیا تو مطلع اور مقطع کو چھوڑ کر گنتی کے تیرہ شعر مع تکرار ارشاد اور پھر فرمائیے کہ پڑھ ڈالے ہم سمجھے تھے کہ ان کے بعد مشاعرہ ختم ہو گا مگر پھر وہی نمبر ایک والے صاحب نے پڑھنا شروع کیا اب ہم کو ڈر معلوم ہوا کہ کہیں پھر سے نہ پڑھنا شروع کر دیں کیونکہ نیند کے مارے بُرا حال تھا اور شور و غل اونگھنے تک نہ دیتا تھا مگر خیر ان کی غزل کے بعد مشاعرہ ختم ہو گیا اور ہم صبح ہونے سے ٹھیک آدھ گھنٹہ پہلے گھر آ گئے، گھر پر آ کر ہم نے لاکھ لاکھ مشاعرہ کے شعر یاد کرنا چاہے لیکن سوائے صیاد، بلبل اور آشیانے کے کچھ یاد ہی نہ آیا جب دماغ پر بہت زور دیا تو زلف بھی یاد آ گئی اور ہمنے اسی کو مشاعرہ کا ماحصل سمجھا۔

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

قیمت	مختصر کیفیت	نام کتاب
عمر	خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے حالات۔	تاریخ الدولتین
ے	جنسیات پر ایک مبسوط کتاب۔	ترغیبات جنسی
۱۲ار	بھاشا کے جواہر پارے اور بھاشا انشاپردازی کی خوبیاں۔	جذبات بھاشا
للعہ ر	بلند پایہ علمی اور ادبی افسانوں کا مجموعہ۔	جمالستان
۱۲ر	بے نظیر عشقیہ فسانہ۔	شاعر کا انجام
عہ ۸ر	نبی کریمؐ کی صحابیات کے سبق آموز حالات۔	صحابیات
عہ ر	تین اہم ترین علمی مضامین کا مجموعہ۔	علمائے قدیم
عہ ر	ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر قسمت کا حال جاننا۔	فراست الید
۶ر	کیوپڈ اور سائیکی کے فسانۂ عشق۔	کیوپڈ و سائکی
عہ ر	دنیا کی تہذیب اور تمدن میں عورت کا ہاتھ۔	گہوارۂ تمدن
عہ ر	ٹیگور کی مشہور فلسفیانہ نظموں کا ادبی ترجمہ۔	گیتان جلی
ہے ر	سنہ ۱۹۲۲ء سے سنہ ۱۹۲۶ء تک کے علمی، ادبی اور تاریخی مضامین۔	مجموعہ استفسارات حصہ ۱
ہے ر	سنہ ۱۹۲۷ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک کے علمی اور تاریخی مضامین۔	” حصہ ۲
ہے ر	سنہ ۱۹۳۳ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک کے علمی اور تاریخی مضامین۔	” حصہ ۳
عہ ر	مصطفےٰ کامل پاشا مصری کی ایک سیاسی کتاب کا ترجمہ۔	مسئلۂ شرقیہ
عہ ۸ر	مولانا کے ادبی اور رنگین خطوط کا مجموعہ۔	مکتوبات نیاز
۸ر	نام نہاد لیڈروں کا کچا چٹھا۔	نقاب اٹھ جانے کے بعد
عہ	مولانا کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔	نگارستان

ملنے کا پتہ
نگار بک ایجنسی لکھنؤ یا صدیق بک ڈپو لکھنؤ